طلوعِ اسلام

ستمبر ۱۹۵۳

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

۱. تنہا فکرِ انسانی (عقل) زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

۲. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر صحیح منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

۳. حق و باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے، جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

۴. حضور نبی اکرم انسانی بشر ہونے کے باوجود بلند ترین عظمتوں کے پیکر تھے لیکن جو باتیں حضور سے ہماری تاریخ میں منسوب ہو کر شامل کر لی گئی ہیں جو حضور کی سیرت و کردار کے شایانِ شان نہیں، وہ ہماری تاریخ میں اگرچہ آ گئی ہیں (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط و وضعی ہیں۔ حضور کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

۵. قرآن کی رو سے نہ صرف یہ ہے کہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں، بلکہ اس کا آئیڈیل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

۶. اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ ان قوانین میں حسبِ ضرورت تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ یہ جزئی قوانین حالات کے ساتھ بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

۷. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو اور کوئی فرد معاشرہ میں اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیتِ عامہ یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۸. ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرہ کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے۔ اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہیں رہے گا۔ اسے قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے تاکہ مستقل اقدار کی روشنی میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو سکے اور اس طرح زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک و مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کیجئے اور طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

-/10/-

ترجمان حقیقت محترم پرویز صاحب کے قلم سے

سلیم کے نام خطوط

ھمارے نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جسقدر شکوک پیدا ھوتے ھیں ان کا نہایت شگفتہ شاداب اور سائنٹفک انداز میں تسکین بخش جواب

ان خطوط میں ملت کے اس نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مخاطب کیا گیا ھے جو مشرق و مغرب کے تصادم کے بعد دور ملوکیت کے وضع کردہ غلط مذھبی تصورات سے متنفر ھوتے ھوتے اسلام اور اس کے سرچشمہ حیات، قران سے بھی ہاتھ دھو چلا تھا۔عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کی گئی ھے کہ محسوس ھی نہیں ھوتا کہ ھم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رھے ھیں ۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکہ آراء مسائل حل کرکے رکھ دئے گئے ھیں جنہیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جاسکا تھا ۔ یہ خطوط ملک کے گوشہ گوشہ سے خراج تحسین وصول کرچکے ھیں۔قران کی روشنی اور محترم پرویز صاحب کا بصیرت افروز قلم۔اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اس مجموعہ میں وہ خطوط بھی شامل ھیں جو طلوع اسلام میں شائع ھوچکے ھیں اور وہ بھی جو ابتک کہیں شائع نہیں ھوئے ۔

کتاب بڑے سائز کے قریب سوا چار سو صفحات پر پھیلی ھوئی ھے۔کتابت و طباعت دیدہ زیب ۔ کاغذ سفید ۔گرد پوش مصور مشرق جناب چغتائی کے حسین قلم کا مرقع ۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف چھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام
کوی روڈ (صدر) ۔ کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدل اشتراک	مرتّب	قیمت فی پرچہ
سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)	سعید احمد	دس آنے (پاکستانی)
غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ		بارہ آنے (ہندوستانی)

نمبر ۹	ستمبر ۱۹۵۳ء	جلد ۶

فہرست مضامین

قرآن نے کیا کہا؟	۴	طاہرہ کے نام خط	۵۱ - ۶۰
خدا نے سُن لی	۵	(محترم پرویز صاحب)	
لمعات	۶ - ۱۰	حقائق و عبر:	۶۱ - ۶۴
سلیم کے نام خط	۱۱ - ۳۷	۱- مردہ شہید	
(محترم پرویز صاحب)		۲ - ملا کی حکومت	
نزول عیسیٰ بن مریمؑ کی حدیثیں اور ان کی تنقید	۳۸ - ۴۷	باب المراسلات:	۶۵ - ۶۹
(علامہ تمنا عمادی)		۱- طلوع اسلام اور نماز	
ایمان کی بات (نظم)	۴۹ - ۵۰	۲- ان من اہل الکتاب کی تفسیر	
(محترم اسد ملتانی)		۳ - ستون چشم بددور	
		حلقۂ معاونین طلوع اسلام	۷۰ - ۷۱

قرآن نے کیا کہا؟

ذہن انسانی کی اپنے عہد طفولیت میں حالت یہ تھی کہ یہ نہ تو کائنات میں واقعہ ہونے والے حوادث کے اسباب و علل کو سمجھ سکتا تھا اور نہ ہی مختلف حوادث (Events) میں کوئی ربط یا ہم آہنگی محسوس کرتا تھا۔ اس کے نزدیک ہر حادثہ ایک الگ، انفرادی حادثہ (Individual Event) تھا اور یونہی، بغیر کسی سبب یا وجہ کے (Haphazardly) رونما ہو جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انسان کی اپنی زندگی میں بھی نہ کوئی ربط و نظم تھا اور نہ ہی کوئی قاعدہ اور قانون۔

قرآن نے آکر بتایا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر جگہ قانون کارفرما ہے اور ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لے کر بڑے سے بڑے کرہ تک ہر ایک، قانون کے سلسلے میں جکڑا ہوا ہے۔ لہٰذا، یہاں کوئی حادثہ یونہی اندھا دھند رونما نہیں ہو جاتا بلکہ علت و معلول (Cause and Effect) کے قانون کے مطابق واقعہ ہوتا ہے اور تمام حوادث باہم گرم مربوط ہوتے ہیں۔ قانون کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ اور تو اور، خود اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے مطلق اختیار پر از خود پابندیاں عائد کر کے اسے قانون کے ساحلوں میں محصور کر دیا ہے۔

اس تصور نے انسانی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس سے ان کا زاویۂ نگاہ خالصۃً سائنٹفک ہو گیا۔ اس سے ان میں قانون کا شعور (Sense of Law) پیدا ہو گیا اور انھوں نے قانون کا احترام سیکھا۔ اب انھوں نے جذبات کی بجائے عقل و شعور سے کام لینا شروع کیا۔ اپنے دعوے کو اندھا دھند (جبر و اکراہ سے) منوانے کی بجائے دلیل و برہان کے زور پر پیش کرنے کا سلیقہ سیکھا۔ اختلافی مسائل میں دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ چونکہ قاعدے اور قانون کے مطابق کام کرنے میں، عمل اور اس کے نتیجے میں ایک وقفہ ہوتا ہے، اس لئے اس سے ان میں تحمل، بردباری، استقامت اور استقلال کے جوہر پیدا ہوئے۔ جب نتیجہ حسب توقع نکلا تو اس کا (Credit) خود لینے کے بجائے، اس قانون کو درخورِ ستائش قرار دیا اور اگر نتیجہ اس کے خلاف برآمد ہوا تو اپنے پورے طریق کار کا جائزہ لیا تاکہ دیکھا جائے کہ کہاں غلطی واقعہ ہو گئی ہے۔ اب ان کے معتقدات کی حیثیت، محض عقیدے (Dogma) کی سی نہ رہ گئی بلکہ ان کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار ان کے نتائج قرار پا گئے۔ صحیح عقیدہ وہ جو خوشگوار نتائج برآمد کرے اور غلط وہ جس کے نتائج خوشگوار نہ ہوں۔ جو عقیدہ کوئی نتیجہ برآمد نہ کرے وہ لغو اور بیہودہ۔ چونکہ قانون کے نتائج ہمیشہ اجتماعی کوششوں سے مرتب ہوتے ہیں جن میں مختلف افراد کو ایک ایک ٹیم (Team) کی طرح کام کرنا پڑتا ہے، اس لئے اس سے ان میں باہمی تعاون و ائتلاف کا جذب پیدا ہوا اور زندگی نظم و ضبط کی خوگر (Disciplined) ہو گئی۔

یہ تھیں وہ خصوصیتیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئیں اور جن کے زور پر وہ ساری دنیا پر چھا گئے۔ یہ سب نتیجہ تھا اس بنیادی تصور کا جس کی رو سے قرآن نے ان میں قانون کا شعور (Sense of Law) پیدا کر دیا تھا۔ لیکن جب بعد میں قرآن کا دیا ہوا دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قانون کا شعور ختم ہو گیا (کیونکہ مذہب کا مدار جذبات پر ہوتا ہے، قانون پر نہیں) اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام خصوصیات بھی ختم ہو گئیں جن سے مسلمان کو دنیا کی امامت نصیب ہو گئی تھی۔

آج بھی دنیا میں وہی قوم آگے ہے جس میں قانون کا شعور ہے۔

خدا نے سُن لی

۵ اگست کو کراچی میں بوندا باندی سی شروع ہوئی۔ ہمارے دارالسلطنت کی وہ دو اڑھائی لاکھ آبادی، جو اب مستقل طور پر "پناہ گزیں" کہلانے لگ گئی ہے اور (ہماری بدبختی سے) جس کے معنی رفتہ رفتہ "شودروں" کے سے ہو گئے ہیں، ابھی تک بانس اور ٹاٹ کی جھونپڑیوں میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ اس بوندا باندی سے ان پر تردد کے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے اور انھوں نے جی ہی جی میں کہنا شروع کر دیا کہ یا اللہ! اس مرتبہ تو پچھلے سال کی سی تباہی نہ آجائے۔

بوندا باندی نے بارش کی شکل اختیار کر لی اور ان کی جھونپڑیوں کی چھتیں ٹپکنے لگ گئیں۔ اب انھوں نے ذرا اونچے اونچے اپنے خدا کو پکارنا شروع کیا۔

لیکن بارش بڑھتی چلی گئی۔ ان کی جھونپڑیوں کی چھتیں نیچے گر گئیں۔ پانی ان کے اندر آ گیا۔ اب انھوں نے بڑی گڑگڑاہٹ سے خدا کو پکارنا شروع کیا اور زور زور سے دعائیں مانگنے لگے۔

لیکن بارش نے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ آسمان سے موسلا دھار بارش، زمین سے موج در موج طغیانیاں، تا بحد نگاہ جدھر دیکھو پانی ہی پانی۔ ان کی جھونپڑیاں بہ گئیں۔ اثاث البیت طوفان کی نذر ہو گیا۔ بچے پانی میں ڈوب گئے۔ بوڑھے، ضعیف اور بیمار، بارش کی شدت اور بھوک کی تیزی سے دم توڑنے لگے۔ جن میں کچھ سکت تھی وہ آس پاس کے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے اور وہاں اذانیں دینی شروع کر دیں تاکہ کسی نہ کسی طرح ان کی آواز خدا تک پہنچ جائے۔

بالآخر ان کے خدا نے ان کی آواز سن لی اور ان کی فریاد کے جواب میں عرشِ عظیم سے آواز آئی کہ

> جب دنیا میں پہلی مرتبہ طوفان آیا ہے تو ہمارے ایک مخلص بندے (حضرت نوحؑ) نے ہمیں پکارا تھا۔ ہم نے اس سے کہا تھا کہ طوفان سے بچنا چاہتے ہو تو ایک کشتی بناؤ۔ اس نے ہماری بات مان لی اور کشتی تیار کر لی۔ جب طوفان آیا تو وہ اور اس کے ساتھی بچ گئے اور جنھوں نے کشتی نہیں بنائی تھی وہ تباہ ہو گئے۔
>
> لہٰذا سنت اللہ (خدا کا قانون) یہ ہے کہ طوفان سے وہی بچ سکتا ہے جو طوفان آنے سے پہلے کشتی بنا لے۔ جب ہمارے اس قانون سے نوحؑ جیسا پیغمبر مستثنیٰ نہیں رہ سکا تو تم کس طرح مستثنیٰ رہ سکتے ہو؟ تم نے مسلسل چھ برس تک آزما کر دیکھ لیا کہ کشتی کے بغیر طوفان سے نہیں بچا جا سکتا۔ اگر چھ سو برس تک بھی آزمائے جاؤ گے تو یہی کچھ ہو گا۔
>
> لہٰذا، اس سنت اللہ کو یاد رکھو کہ جو قوم طوفان آنے سے پہلے کشتی نہیں بنا لیتی وہ ہمیشہ تباہ ہو جایا کرتی ہے۔ اس میں نہ نوحستان کو کوئی رعایت ملی تھی نہ پاکستان کو رعایت ملے گی۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جیسا کہ ہم کئی بار لکھ چکے ہیں، مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ یہ معاملات کے فیصلے عقل و خرد اور فکر و تدبر کی بجائے جذبات کی رو سے کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ذرا تاؤ میں آئے تو خواہ مخواہ مکا دکھا دیا اور اس کے برعکس کسی نے ذرا چکنی چپڑی باتیں کیں اور یہ پگھل گئے۔ ظاہر ہے کہ دنیائے معاملات (بالخصوص بساطِ سیاست) میں اس روش کی حامل قوم، قدم قدم پر پٹ جاتی ہے۔ ویسے تو مسلمانانِ پاکستان کی زود فراموشیوں اور ارزاں فروشیوں کے کئی منظر اس قلیل سی مدت میں دیدۂ بینا کے سامنے آچکے ہیں لیکن گذشتہ ماہ، بھارت ورش کے مہامنتری پنڈت جواہر لال جی نہرو کے پاکستان تشریف لانے پر اس کا مظاہرہ جس وسعت اور شدت سے ہوا اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ ان کی آمد پر قوم کی طرف سے جن جذبات کا اظہار ہوا ان سے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ان کے نزدیک وہ مسیحا آپہنچا ہے جس کے ہاتھ میں ان کے تمام دکھوں کا مداوا اور ان کی تمام مصیبتوں کا حل ہے۔ ہر ایک یوں سمجھے بیٹھا تھا کہ نہرو جی پورے کا پورا کشمیر ان کے حوالے کر دیں گے۔ تمام دریاؤں کا رخ پاکستان کی طرف موڑ دیں گے تاکہ یہاں آب پاشی کیلئے پانی کی قلت نہ رہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی سرحد پر سے اپنی چھاؤنیاں اٹھا لیں گے۔ جو کچھ آج تک چور دروازوں کے راستے ہندوستان جا رہا ہے اس کی روک تھام کر دیں گے۔ ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین کی تمام جائدادوں کی قیمت نقد ادا کر دینگے اور جائدادوں کے علاوہ یہ لوگ جو کچھ وہاں چھوڑ آئے ہیں وہ سب کچھ یہاں پہنچا دیں گے۔ یہ کچھ عوام تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ہمارے اربابِ سیاست تک بھی اسی فریب میں مبتلا تھے کہ اب پاکستان اور ہندوستان کے متنازعہ فیہ امور کی تمام گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ ہم یہ کچھ دیکھ رہے تھے اور محوِ حیرت تھے کہ یا اللہ! یہ قوم بھی کسقدر سادہ اور بھولی واقع ہوئی ہے! بارے غنیمت ہوا کہ یہ فریب زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا۔ نہرو جی نے یہاں کے احوال و کوائف کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا اور اس کے بعد نہایت اطمینان سے کشمیر میں وہ کچھ کر دیا جس سے مسلمانانِ عالم کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ جس وقت یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، پاکستان کے وزیرِ اعظم مسئلہ کشمیر کے متعلق ہندوستان کے وزیرِ اعظم کے ساتھ گفتگوئے مصالحت میں مصروف ہیں۔ ہم پیش گوئی تو نہیں کرنا چاہتے کہ ان مذاکرات کا آخری نتیجہ کیا ہوگا لیکن اس دوران میں ہم اتنا بتا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے بارہ میں ہمیں قرآن نے کیا راہنمائی دی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن تمام نوعِ انسانی کے ساتھ عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے لیکن وہ انسانوں کے مختلف گروہوں کے فرق کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ کھلے کھلے الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ ظالم اور مظلوم میں نمایاں فرق ہے۔ اگر تمہیں مظلوم کے ساتھ

ہمدردی ہے تو تم ظالم کے ساتھ دوستی کے تعلقات قائم نہیں رکھ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ حق و باطل، کفر و ایمان، نور و ظلمت اور فساد و صالحیت کے اعتبار سے دنیا میں دو بالکل متضاد اور باہمدگر مخالف گروہ چلے آئے ہیں۔ دنیا میں جب اور جہاں کہیں حق اور باطل کا معرکہ گرم ہوتا ہے تو یہی دو گروہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوتے ہیں۔ وہ حق و صداقت کے حامیوں کو حزب اللہ یا جماعت مومنین کہہ کر پکارتا ہے اور ان کے فریق مقابل کو حزب الشیطان یا کفار کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مومن، مومن کا دوست ہوتا ہے (والمؤمنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض ۹/۷۱) اور کافر، کافر کا دوست ہوتا ہے (والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض ۸/۷۳) اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ کفار کا گروہ ہمیشہ تمہارا مخالف اور دشمن رہے گا (ان الکافرین کانوا لکم عدوا مبینا ۴/۱۰۱) لہٰذا

جو لوگ ایمان والے ہیں انھیں کبھی ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کفار سے دوستی کے تعلقات پیدا کریں جس کسی نے ایسا کیا تو وہ یاد رکھے کہ اس کا اللہ کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رہا۔ تمہیں چاہئے کہ کفار کی طرف سے اپنی حفاظت کا پورا پورا انتظام رکھو (۳/۲۸)

دوسری جگہ ہے:-

اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی اور کو اپنا ہمراز اور معتمد نہ بناؤ۔ یہ لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وہ ہمیشہ تمہاری ضرر رسانی کی تمنا رکھتے ہیں۔ بعض منصوبے تو ان کے منہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں لیکن جو کدورت ان کے دل میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ . . . . . اگر کہیں تمہارے بھلے کی کوئی بات ہو جائے تو وہ ان کیلئے غم کا موجب بن جاتی ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آجائے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر تم ثابت قدم رہو اور ان کی طرف سے اپنی حفاظت کرتے رہو تو پھر ان لوگوں کی تدبیریں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ (۳/۱۱۷-۱۱۹)

غیر تو ایک طرف اس نے یہاں تک کہدیا ہے کہ

اگر تمہارے باپ اور بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو عزیز رکھیں تو انھیں اپنا دوست نہ بناؤ۔ جو کوئی ان سے دوستی کے تعلقات قائم کرے گا تو یاد رکھو اس کا شمار بھی انہی میں ہو جائے گا۔ (۹/۲۳)

سورۂ مجادلہ میں ہے کہ

تم کبھی ایسا نہ دیکھو گے کہ وہ لوگ جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے دوستی کے تعلقات قائم کرنے لگیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں خواہ وہ ان کے اپنے باپ اپنے بھائی اور اپنے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ (۵۸/۲۲)

اتنا ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے متعلق بھی جو دین خداوندی کی تضحیک کرتے ہوں صاف صاف طور پر کہدیا کہ انھیں بھی کبھی اپنا دوست نہ بناؤ۔ (۵/۵۷) یہ قرآن کریم کے صریح احکام ہیں جن کیلئے نہ کسی تفسیر کی ضرورت ہے نہ تشریح کی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے انسانی تعلقات کی بنیاد ہی جداگانہ تجویز کی ہے۔ وہ ان تعلقات کو تصورحیات (Ideology) کی بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا کے تمام انسان خواہ وہ کسی قوم کسی نسل، اور کسی خطہ کے ہوں (Ideology) کے اشتراک کی بنیاد پر ایک ملت

بن جاتے ہیں۔ اور جو لوگ اس (Ideology) کے مخالف ہوں وہ ان کے مخالفین قرار پاتے ہیں۔ وہ جماعتِ مخالف کے ساتھ عدل و انصاف کے برتاؤ کا تو حکم دیتا ہے لیکن ان سے اعتماد، بھروسہ، رازداری اور دوستداری کے تعلقات سے بڑی شدت سے روکتا ہے اسلئے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ جو قوم آپ کی (Ideology) کی مخالف ہو وہ آپ کی بہبودی اور خوش حالی کی آرزومند ہو۔ جیسا کہ قرآن نے کہا ہے وہ تمہاری مصیبتوں سے خوش ہوگی اور تمہاری راحتیں ان کے لئے سوہانِ روح بن جائیں گی۔ اسلئے یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی ایسی اسکیم یا تدبیر کی تائید کریں جو آپ کے لئے نفع مند ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم میں اسلام کی کوئی بات باقی نہیں رہی لیکن اسلام سے خالی نسبت بھی ہمارا اتنا بڑا جرم ہے جس کی بنا پر دنیا کا کوئی غیر مسلم کبھی ہمارا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے ہندوؤں کی طرف سے جو برتاؤ ہمارے ساتھ ہوتا رہا وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جو کچھ ان کی طرف سے ہوتا چلا آرہا ہے اسے اندھوں نے بھی دیکھا اور بہروں نے بھی سنا ہے۔ آپ اس چھ سالہ زندگی پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ آپ کو اس ہمسایہ قوم میں شرف انسانیت کی کوئی جھلک بھی دکھائی دی ہے؟ اس کے برعکس وعدہ خلافی، دروغ بافی، کذب تراشی، افترا پردازی کی کوئی شق بھی ایسی ہے جسے انھوں نے آپ کے خلاف اختیار نہ کیا ہو۔ درازدستی، سلب و نہب، لوٹ کھسوٹ کی کوئی نہج ایسی ہے جس کا مظاہرہ ان کی طرف سے نہ ہو چکا ہو۔ معاہدات شکنی، بین الاقوامی قوانین سے سرکشی، حقوق ہمسائگی کی حدود فراموشی، فیصل شدہ معاملات کی خلاف ورزی کی کوئی صنف ایسی ہے جو ان کی طرف سے عمل میں نہ لائی جا چکی ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قتل و غارتگری تباہی اور بربادی، عصمت دری اور عفت ربودگی، مسلم کشی اور انسانیت سوزی کی کوئی داستان ایسی ہے جو ان کے سیاہ کارناموں کے سامنے ماند نہ پڑ چکی ہو؟ یہ اس لئے کہ خود حکومت ہندوستان کے وزیر تعلیم ابوالکلام صاحب آزاد کے الفاظ میں (جو انھوں نے اس زمانے میں لکھے تھے جب ان کی حق گوئی پر سیاسی مصلحتوں کا پردا نہیں پڑا تھا۔)

> کفار واقعات کو جھٹلاتے ہیں، حقیقت حال کو جھٹلاتے ہیں، اصلیت کو چھپاتے ہیں، ماجرائے وقوع کو غلط بتاتے ہیں، نقض امن کرتے ہیں اور اسے جان بخشی دکھاتے ہیں۔ بات کچھ اور ہوتی ہے مگر اپنی بات کی پچ میں پبلک کو کچھ اور جتاتے ہیں۔ ان کے عہد و پیمان کا تمہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں، عزت نفس اور شرف ذات کا انھیں لحاظ تک نہیں قسمیں کھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے، اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے، یہ قول و اقرار قانونی حیثیت رکھتا ہے، زبانی سب کچھ کہتے ہیں اور ہاتھ سے کام لیتے وقت کچھ بھی یاد نہیں رکھتے۔ اسلام اپنے فرزندوں کو پکار پکار کر کہتا ہے کہ خبردار یہ قسمیں کھانے والے ذلیل ہیں، ان کے حلف پر نہ جانا، یہ اِدھر کی بات اُدھر لگاتے ہیں، منع خیر کے لئے نہایت مبالغہ کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ تعدی ان کا شیوہ ہے۔ تطاول ان کی عادت ہے۔ سرکشی ان کی خو ہے۔ پاس عزت نہ رکھنے، ناموس کی نگہداشت نہ ضروری سمجھنے کی وجہ سے ان کی تواصل تک محفوظ نہیں۔
>
> (الہلال بابت ۲۷ اگست ۱۹۱۳ء)

یہ ہے وہ شہادت جو اسلام اور مسلمانوں کے ان دشمنوں کے متعلق ابوالکلام صاحب آزاد کی طرف سے پیش ہوئی ہے۔ آپ ذرا سوچئے کہ قرآن کے ان حقائق اور تاریخ کے ان شواہد کی موجودگی میں اور اس کے بعد خود اس تجربہ کے پیش نظر جو ان کی طرف سے ہمیں ذاتی طور پر ہو چکا ہے، ان پر کسی معاملہ میں دوستانہ بھروسہ کرنا خود فریبی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوگا کہ ان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا ہو۔ قرآن ہمیں یہ کہتا ہے کہ فریق مخالف کے ساتھ تعلقات معاہدہ کی رو سے قائم ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرتا کہ جو لوگ اخلاقی اقدار کو کوئی وقعت نہیں دیتے ان کے نزدیک معاہدہ کی بھی کچھ حیثیت نہیں ہوتی۔ سولن کے الفاظ میں، معاہدہ مکڑی کا جالا ہوتا ہے جو اپنے سے طاقتور کے سامنے تار عنکبوت کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اپنے سے کمزور کو بڑی آسانی سے پھانس لیتا ہے۔ اس لئے قرآن اس پر زور دیتا ہے کہ تمہارے اپنے اندر اتنی قوت ہونی چاہئے کہ فریق مخالف معاہدہ شکنی کی جرأت ہی نہ کر سکے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری سرحدیں اس قدر مضبوط ہونی چاہئیں جن سے دشمن کے دل دہل جائیں۔ لہٰذا ہمیں ہندوستان یا کسی دوسرے ملک سے معاہدہ کرنے سے پہلے اپنے اندر وہ طاقت پیدا کرنی چاہئے جو استواری عہد کی ضامن بن سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ طاقت کا دوسرا نام فوج ہے لیکن دور حاضر میں شہری آبادی (civil population) کی طاقت کو فوجی طاقت کے مقابلہ میں کچھ کم اہمیت حاصل نہیں۔ فوجی طاقت انڈے کا چھلکا ہوتی ہے۔ اگر انڈا کچا ہے تو وہ چھلکا معمولی سی ٹھیس لگنے سے بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ لیکن اگر انڈا ابلا ہوا (لہٰذا ٹھوس ہے) تو اس کا چھلکا بھی بہت مضبوط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کسی مملکت کی قوت کا راز اس کی شہری آبادی کی یک نگہی، یک جہتی، عزیمت، ثبات، استقلال اور بلند حوصلگی میں مضمر ہوتا ہے۔ لیکن یہ جوہر اسی قوم میں پیدا ہو سکتے ہیں جنہیں نظم و نسق حکومت پر پورا پورا بھروسہ ہو۔ جو انھیں اپنا ہمدرد اور مشفق سمجھے۔ جہاں سے انھیں عدل و انصاف کی پوری پوری توقع ہو۔ جنھیں وہ اپنے مال اور جان اور عزت و ناموس کا محافظ اور اپنے اہل و عیال کا نگراں و پاسباں تصور کریں۔ جنھیں اس کا محکم یقین ہو کہ یہ نظم و نسق ہماری بہبودی، خوشحالی اور ترقی کے لئے قائم ہے، جنھیں اس پر ایمان ہو کہ اس نظم و نسق کے قیام سے عدل و احسان کا قیام وابستہ ہے اور اس کے گر جانے سے شرف انسانیت کا قصر بلند گر جائے گا۔ جس قوم کو اپنی مملکت کے نظم و نسق کے متعلق اس قسم کا یقین ہو، وہ قوم اس مملکت کی حفاظت اور اس نظم و نسق کے استحکام کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر تیار رہتی ہے۔ تیار ہی نہیں بلکہ بیقرار رہتی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے باشندوں کو اپنے نظم و نسق کے متعلق اس قسم کا یقین اور اعتماد ہے تو پھر آپ کو کسی گوشہ اور کسی سمت سے کوئی خوف اور اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ پھر آپ دنیا کی ہر قوم کے ساتھ برابر کے معاہدات کیجئے، انھیں اس کی جرأت ہی نہیں ہو سکے گی کہ وہ ان معاہدات کے ایک حرف کی بھی خلاف ورزی کر سکیں۔ لیکن اگر آپ کو اس کا یقین محکم نہیں تو پھر آپ کو نہ ہندو سے کسی بھلائی کی توقع رکھنی چاہئے نہ انگریز سے۔ نہ امریکہ سے کسی امداد کی امید کرنی چاہئے نہ روس سے۔ دوسرے کی نگاہوں میں اس کی عزت ہوا کرتی ہے جس کی عزت خود اپنوں کی نگاہوں میں ہو۔ لیکن اس عزت کے ماپنے کا پیمانہ نہ تو وہ جلسے ہیں جن میں پچاس پچاس ہزار آدمی تقریریں سننے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں اور نہ ان کے وہ فلک شگاف نعرے جو فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ ہماری قوم شاعروں کی قوم ہے

جن کے نزدیک یہ جلسے بزم مشاعرہ اور ان کے نعرے شاعروں کی داد سے زیادہ کچھ معنی نہیں رکھتے۔ نہ ہی اس عزت کا معیار الیکشنوں کی جیت ہے جسے ہر برسر اقتدار پارٹی تدبر کی فسوں سازیوں کی بنا پر حاصل کر سکتی ہے۔ [اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو شخص اقتدار کی مسند سے الگ ہو جاتا ہے اس کا کسی الیکشن میں جیتنا تو درکنار اسے کرائے پر مکان تک بمشکل ملتا ہے] اس عزت کا صحیح معیار یہ ہے کہ

کہتی ہے تم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟

اس قسم کی صحیح عزت حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ ہے ربوبیتِ عامہ۔ یہ ایسی بنیادی شرط ہے کہ جو باپ اپنے بچوں کی پرورش نہیں کرتا وہ بچوں کی نگاہ میں کسی عزت کا مستحق نہیں ٹھہرتا۔ اس سے بھی آگے بڑھئے۔ خود خدا نے یہ کہہ دیا ہے کہ الحمد للہ رب العلمین کہ اللہ کی حمد و ستائش بھی اسلئے ہے کہ وہ ربوبیتِ عامہ کا ذمہ دار ہے۔ جب ربوبیت کے بغیر خدا کی بھی حمدیت نہیں تو اور کون ہو سکتا ہے جسے ربوبیت کے بغیر عزت حاصل ہو جائے۔ جو لوگ خالی الفاظ سے درخورِ حمد و ستائش بننا چاہتے ہیں ان کے متعلق خود خدا نے کہدیا ہے کہ "یریدون ان یحمدوا بما لم یفعلوا"۔ ان بیوقوفوں کی بھول دیکھئے کہ یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ یہ کر کے نہیں دکھاتے اس کی وجہ سے ان کی تعریف کی جایا کرے۔

اور اس ربوبیت کا طریقہ صرف یہ ہے کہ مملکت میں قرآن کا تجویز کردہ نظام ربوبیت رائج کیا جائے۔ اس کے سوا نہ مملکت کے استحکام کا کوئی اور طریقہ ہے اور نہ ہی نظم و نسق مملکت کے سزاوارِ حمد و ستائش ہونے کا کوئی ذریعہ۔ وفیھا بصائر لقوم یتفکرون۔

تبدیلیٔ پتہ

طلوع اسلام کا دفتر اب کراچی (صدر) کے علاقہ میں منتقل ہو کر آ گیا ہے۔ ڈاک کا پتہ یہ ہو گا۔

کوی روڈ۔ کراچی

خود تشریف لانے کیلئے یہ سمجھ لیجئے کہ کراچی (صدر) میں پیراڈائز سینما سے جو سڑک دفتروں کو جاتی ہے اس پر دائیں ہاتھ کو تیسری گلی کی طرف مڑیئے (یہ گلی فریئر روڈ کے چوک میں جا کر مل جائیگی) دفتر طلوع اسلام اسی گلی میں سڑک کے کنارے واقع ہے۔ باہر بورڈ آویزاں ہے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کوی روڈ۔ کراچی

سلیم کے نام....

(خدا کا قانون)

تقدیر

(پرویز)

سلیم! میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ ابھی انسان کے متعلق باتیں کرو، خدا کے متعلق کچھ نہ پوچھو[1] لیکن تمہاری ضد کا کیا علاج! یہ سب الجھنیں اسی لئے پیش آرہی ہیں کہ تم نے اس دانائے راز کی بات کو نہ سمجھا جس نے کہا تھا کہ

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے　　بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاک

مجھے معلوم نہیں کہ تمہارا یہ "قدامت پسند" دوست کون ہے لیکن جو اعتراض اس نے کیا ہے اس سے اس کی ذہنیت اور فکری سطح کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کا اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ ہر بات خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے تو پھر خدا کیا کرتا ہے؟ اس کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے! اگر مرض بھی اس کے قانون کے مطابق آتا ہے اور شفا بھی اس کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔ اگر موت بھی اس کے قانون کے مطابق آتی ہے اور زندگی بھی اس کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔ اگر عزت بھی اس کے قانون کے مطابق ملتی ہے اور ذلت بھی اس کے قانون کے مطابق آتی ہے تو پھر خدا کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ سب کچھ قانون ہی قانون ہے خدا کچھ بھی نہیں

قدامت پرستی میں خدا کا تصور

یہ ہے اس کے اعتراض کا خلاصہ۔ تم نے سلیم! غور کیا کہ یہ اعتراض کس ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے؟ اس ذہنیت کی جس کی رو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ خدا وہ ہے جو کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں۔ جب جی میں آیا ایک حکم دیدیا اور جب جی چاہا دوسری قسم کا حکم نافذ کر دیا۔ جسے چاہا پکڑ لیا جسے چاہا چھوڑ دیا۔ بقول اس پنجابی شاعر کے۔

اوتھے کیہہ پرواہ اے راقب) اوتھے بے پروائیاں
پھڑ لئے عملاں والیاں نوں، چھڈ دیئے اوگن ہاریاں نوں

[راقب! اس کے ہاں کیا پرواہ ہے۔ وہاں سب کام بے پرواہی سے ہوتے ہیں وہ چاہے تو نیک عمل والوں کو پکڑ لے اور گنہگار کو چھوڑ دے۔]

---

[1] اس موضوع کا پہلا حصہ "خدا کا تصور" کے عنوان سے جولائی ۱۹۵۲ء کے طلوعِ اسلام میں چھپ چکا ہے اور مجموعۂ خطوط میں شامل ہے اس خط کو اس خط کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے۔

کبھی پانی سے کہدے کہ تو آگ لگا دیا کر اور کبھی آگ سے کہدے کہ تو برف جما دیا کر۔ کبھی کیکر میں انگور کے خوشے لٹکا دے اور کبھی انگور کی بیل سے حنظل پیدا کر دے۔ کبھی مجرم کو مقرب بارگاہ بنا لے اور کبھی بے گناہ کو پھانسی پر لٹکا دے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ خدا کا یہ تصور کہاں سے لیا گیا؟ یہ تصور ہے ایک مطلق العنان بادشاہ کا جو کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہ ہو۔ جس کا ہر حکم قانون بن جائے اور وہ حکم لمحہ بلمحہ بدلتا رہے۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ جو جی میں آیا کہہ دیا اور جو چاہا کر دیا۔ وہ بادشاہ جن کے متعلق ہمارا "معلم الاخلاق" (سعدی) کہتا ہے کہ گاہ بلاے برنجند و گاہ بہ دشنامے خلعت بہ بخشند (کبھی انھیں سلام کہنے پر غصہ آجائے اور کبھی گالی دینے والے کو خلعت عطا فرما دیں) یہ تھا وہ بادشاہ جو ظل اللہ (خدا کا سایہ) کہلاتا تھا۔ لہٰذا جس قسم کا بادشاہ زمین پر تھا اسی قسم کا خدا آسمان پر تھا۔ یہ بھی کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہ تھا۔ وہ بھی کسی آئین اور ضابطے کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اس کے غصے کا بھی یہ عالم کہ کسی ایک نے خطا کی اور حکم صادر ہو گیا کہ گاؤں کے گاؤں کو جلا دو۔ اس کے قہر کی بھی (معاذ اللہ) یہ کیفیت کہ بدمعاشی پیرس والے کریں اور زلزلہ بہار میں آجائے۔

یہ ہے سلیم! خدا کے متعلق وہ تصور جو ہمارے عہد ملوکیت میں پیدا ہوا اور اب صدیوں سے ہمارے شعور میں متوارث چلا آرہا ہے۔ اب اگر کہا جائے کہ یہاں سب کچھ خدا کے قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے تو چونکہ یہ تصور اس تصور کے ساتھ مطابقت نہیں کھاتا جو ہمارے لاشعور میں مستور چلا آرہا ہے اسلئے ہمارا ذہن اسے قبول کرنے سے ہچکچاتا ہے اور اس کیلئے دلیل یہ پیش کر دیتا ہے کہ اس سے تو خدا کی قدرت اور اختیار پر پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں۔ اس سے اس کا حکم اور ارادہ آئین کی زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے لہٰذا جو خدا قانون کا پابند ہو جائے وہ خدا کیا۔ ایسا کہتے وقت وہ یہ نہیں سوچتے کہ پابندی اُسے کہتے ہیں جو کسی دوسرے کی طرف سے عائد کردہ ہو (خدا تو ایک طرف رہا) اگر کوئی انسان اپنے اوپر کسی قسم کی پابندی آپ عائد کر لے تو اسے پابندی نہیں کہتے بلکہ اُس کا **اصول** کہتے ہیں۔ اور اس حقیقت کو یہ "قدامت پسند" بھی تسلیم کرتے ہیں کہ با اصول ہونا بڑے ہی شرف اور فخر کا باعث ہوتا ہے۔ جو انسان "بے اصولا" ہو اُسے سب ذلیل سمجھتے ہیں۔ لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جس بات کو وہ انسانوں کے لئے وجہ تحقیر و تذلیل سمجھتے ہیں (یعنی "بے اصولے پن" کو) اُسے خدا کے لئے عزت و تکریم کا باعث قرار دیتے ہیں! اللہ میاں بار بار کہہ رہے ہیں کہ لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ تم ہمارے "اصولوں" میں کبھی تغیر و تبدل نہ پاؤ گے۔ لا تبدیل لکلمۃ اللہ۔ ہمارے اصول کبھی بدلا نہیں کرتے۔ لیکن ان "خدا پرستوں" کی کیفیت یہ ہے کہ یہ برابر کہے چلے جا رہے ہیں کہ نہیں! خدا کسی قاعدے اور اصول کا پابند نہیں وہ جس قسم کا چاہے حکم دیدے، یہ کچھ کہتے ہیں اور جی میں سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کی بڑی کبریائی بیان کر رہے ہیں۔ لیکن یہاں "سمجھنے" کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے) یہ دور ملوکیت کا پیدا کردہ تصور ہے جو صدیوں سے لاشعور میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس تصور کو (اگر بادشاہوں نے خود پیدا نہیں کیا تو کم از کم وہ اسے) ہوا ضرور دیتے رہے۔ کیونکہ اس سے ان کی مطلق العنانی کا "بے اصولا پن" اور تلون مزاجی کا "بچپن" خدائی صفات کا مظہر بن کر دکھائی دیتا تھا۔

یہ ہے سلیم! تمہارے دوست کے اعتراض کا ذہنی پس منظر۔

لیکن تم کہدو گے سلیم! کہ قرآن میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن میں لکھا ہے کہ خدا جو چاہے میں آئے کرتا ہے (یفعل ما یشاء)

جس قسم کا جی چاہے حکم دیتا ہے (یحکم ما یرید) اس سے تو اسی تصور کی تائید ہوتی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

اور اگر میں صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاؤں کہ قرآن میں یہ بھی ہے کہ لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا (تم خدا کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے) تو تمہارے دل میں لامحالہ یہ خیال پیدا ہوگا کہ یہ تو کھلا ہوا تضاد ہے۔

لیکن قرآن میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کہیں تخالف اور تضاد نہیں۔

اب تمہارے ذہن میں سخت پریشانی پیدا ہو جائے گی کہ ــــ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ یہ پریشانی تمہارے ہی ذہن میں پیدا نہیں ہوگی

مسئلہ تقدیر

یہ ہمارے ہاں صدیوں سے مسلسل چلی آ رہی ہے۔ اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ فکر و نظر کی جسقدر توانائیاں اس مسئلہ کے حل کرنے میں صرف کی گئی ہیں، کسی اور مسئلہ کے حل کی تلاش میں نہیں کی گئیں تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ہی اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یہ مسئلہ ان کوششوں سے جسقدر پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا گیا ہے اس کی نظیر بھی کہیں اور مشکل سے ملے گی تو اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ یہی وہ مسئلہ ہے جو ذرا آگے بڑھ کر مسئلہ تقدیر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور یہ تم بچپن سے سنتے چلے آ رہے ہو کہ تقدیر کی گتھیاں کسی کے سلجھائے سے سلجھ نہیں سکتیں۔

لیکن سلیم! تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ جس قدر یہ مسئلہ مشکل (بلکہ لاینحل) سمجھا جاتا ہے، قرآن کے ذریعہ سے یہ اتنی ہی آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ بالکل کھلا کھلا اور واضح، جس میں نہ کوئی پیچ رہتا ہے نہ خم، نہ الجھاؤ رہتا ہے نہ سلوٹ، نہ شک رہتا ہے نہ شبہ، نہ اضطراب رہتا ہے نہ پریشانی۔ لیکن اسے ذرا غور سے سمجھنا پڑے گا۔ اس لئے کہ (جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے) ہمارے لاشعور میں صدیوں سے بعض تصورات متوارث چلے آ رہے ہیں۔ انہیں دل کی گہرائیوں سے نکال کر باہر پھینک دینا ذرا ہمت طلب مرحلہ ہوتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک قلب و دماغ سے ان غلط تصورات کو الگ نہ کر دیا جائے۔

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں ۔۔۔ سمجھے گا نہ تو جب تک بیرنگ نہ ہو ادراک

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کی آیات کو اس کے متن (CONTEXT) سے الگ نکال کر سمجھنے کی کوشش کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ ان آیات کا صحیح مفہوم کبھی سمجھ میں نہیں آ سکے گا بلکہ اس سے اسقدر ذہنی انتشار اور قلبی پریشانی پیدا ہو جائے گی جس سے تمہاری نگاہوں میں قرآن چیستاں بن کر رہ جائے گا۔ مسئلہ زیر نظر کے ضمن میں سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ موضوع تین اہم اور بنیادی گوشوں میں بٹ جاتا ہے اور جب تک قرآن کی آیات کو ان کے متعلقہ گوشوں پر نہ رکھ دیا جائے ان کا صحیح مفہوم کبھی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اب سنو، ان تینوں گوشوں کی تفصیل۔

جن مفکرین اور سائنسدانوں نے کائنات کی اس محیر العقول مشینری پر غور کیا ہے وہ بتاتے ہیں کہ یہ سارا نظام علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کی محکم کڑیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہر نتیجے (EFFECT) کا ایک سبب (CAUSE) ہوتا ہے اور کوئی نتیجہ بلا سبب کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ علت و معلول کی اس زنجیر کو پیچھے کی طرف لئے جاتے ہیں تا آنکہ جاتے جاتے

اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں جہاں یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس زنجیر کی پہلی کڑی کسی نہ کسی طرح بغیر کسی سبب کے وجود میں آگئی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے کائنات کی ابتدا ہوتی ہے جہاں یہ عدم سے وجود میں آتی ہے۔ ہمارا ذہن اس کا تصور ہی نہیں کر سکتا کہ کوئی شے کسی طرح عدم (NON-EXISTENCE) سے وجود (EXISTENCE) میں آسکتی ہے۔ یہ چیز ہمارے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی اسلئے کہ

گوشۂ اول مشیتِ مطلقہ

ہمارا ذہن محدود (FINITE) ہے اور کسی محدود (FINITE) میں اس کی استعداد ہی نہیں ہوتی کہ وہ لامحدود (INFINITE) کا تصور کر سکے۔ لیکن یہ بات ہمارے ذہن میں آسکے یا نہ آسکے ایک مقام تو ایسا ضرور ماننا پڑے گا جہاں سے اس سلسلۂ کائنات کا آغاز ہوا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں علت و معلول کا قانون ختم ہو جائے گا۔ یہ وہ گوشہ ہے جہاں خدا نے اپنے آپ کو کہا ہے کہ وہ بدیع السمٰوٰت والارض ہے۔ بدیع کے معنی ہیں ORIGINATOR) یعنی کائنات کو (ORIGINATE) کرنے والا[1] یہ کیسے ہوتا ہے؟ ہم بالکل سمجھ نہیں سکتے۔ ہم صرف علت و معلول کے قانون کو سمجھ سکتے ہیں۔ جس مقام پر یہ قانون ختم ہو جاتا ہے، وہاں کیا کچھ ہوتا ہے اور کس طرح ہوتا ہے یہ ہمارے ادراک سے باہر کی چیز ہے۔ یہ وہ گوشہ ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

انما امرہٗ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون (۳۶/۸۲)

اس گوشہ میں خدا کا امر اس طرح کام کرتا ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کہدیتا ہے کہ ہو جا۔ اور بس وہ ہو جاتی ہے

ظاہر ہے کہ یہ چیز خدا کے اختیارِ مطلق (منشاء، مرضی، ارادہ، مشیت) کے مطابق ہو سکتی ہے۔ اس میں کسی "قاعدے" کی پابندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب کسی شے کو عدم سے وجود میں لایا جائے گا تو اس کے متعلق یہ بھی طے کیا جائیگا کہ اسے کیسا ہونا چاہیے۔ اسکی خصوصیات کیا ہوں گی۔ اس کے اثرات و خواص کیا ہوں گے۔ اس کی ماہیت کیا ہوگی اس کی کیفیت کیا ہوگی۔ اس کا دائرہ عمل کیا ہوگا۔ دوسری چیزوں کے خلاف اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب اس شے کا وجود، خدا کی "مشیت (امر، اختیارِ مطلق) کے مطابق ظہور میں آیا ہے تو اس کے متعلق یہ تمام تضمنات بھی اسی امر کے مطابق طے پائیں گے۔ یہ تضمنات (یعنی اس شے کے خواص و اثرات وغیرہ) وہ بنیادیں ہیں جن پر قانون فطرت (LAW OF NATURE) کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ قوانین بھی خدا کے اسی امر کے مطابق متعین ہوں گے جس کے مطابق خود وہ شے وجود میں آئی ہے۔ شہد کو شیرینی اور نمک کو نمکینی کیوں ملی؟ سنکھیا کیوں مہلک ہے اور پانی کیوں ممد حیات ہے۔ آگ کیوں حرارت پہنچاتی ہے اور ہماری زندگی کا دارومدار ہوا پر کیوں ہے؟ اس

---

[1] قرآن میں (ORIGINATION) اور (CREATION) کے لئے الگ الگ الفاظ آئے ہیں۔ بدیع کے معنی ہیں ... (ORIGINATOR) اور خالق کے معنی ہیں (CREATOR) بداعت کہتے ہیں کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا۔ لیکن تخلیق کے معنی ہیں مختلف عناصر میں نئی نئی ترتیب و ترکیب سے نئی نئی چیزیں وضع کرتے جانا۔ بدیع تو خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن صفت تخلیق میں انسان بھی شامل ہے بلکہ ہو تخلیق نہیں کرتا وہ انسان ہی نہیں۔ یاد رہے کہ تخلیق اور تولید (PRO-CREATION) میں بڑا فرق ہے۔ تولید حیوانی سطح زندگی کا عمل ہے، لیکن تخلیق کا اہل حیوان نہیں انسان ہے۔

"کیوں" کا جواب بھی ہم نہیں دے سکتے۔ اسلئے کہ ہم اسے سمجھ ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا، نہ صرف اشیائے کائنات کا عدم سے وجود میں آنا ہی خدا کی مشیت مطلقہ کے مطابق ہوتا ہے بلکہ ان سے متعلق قوانین کی بنیادیں بھی اسی مشیت کے مطابق طے پاتی ہیں۔

مستقل اقدار

یہ قوانین صرف طبیعی دنیا (PHYSICAL WORLD) تک ہی محدود نہیں۔ انسانی زندگی کے معاملات کے متعلق قوانین بھی اسی گوشے میں متعین ہوتے ہیں۔ جس طرح انگور کے بیج میں یہ خصوصیت رکھدی گئی ہے کہ اس کی بیل میں نہایت لطیف و شیریں آویزے لٹک جائیں اور تخم حنظل کا مآل نہایت تلخ ہو۔ اسی طرح یہ قانون بھی وہیں سے متعین ہوا ہے کہ عدل و احسان کا نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں ہوں اور حقوق انسانیت میں کمی کرنے (ظلم) کا نتیجہ تلخیاں اور تباہیاں۔ جس طرح یہ قانون وہیں سے مرتب ہوا ہے کہ انسانی جسم کی نشوونما اسی خوراک سے ہو سکتی ہے جسے وہ شخص خود کھائے۔ (دوسرے کے منہ میں لقمہ ڈالنے سے اپنے جسم کی پرورش نہیں ہو سکتی) اسی طرح یہ قانون بھی وہیں سے متعین ہوا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما "لینے" سے نہیں بلکہ "دینے" سے ہوتی ہے۔ یہ سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا کہ اس کے لئے وہ قانون کیوں ہے اور اس کیلئے یہ قانون کیوں[1]؟ جو مشیت، انسانی جسم کی مشینری اور انسانی ذات کو وجود میں لائی ہے اسی مشیت نے ان دونوں کے لئے یہ قانون وضع کئے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے بڑے عمدہ انداز میں بیان کیا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے کہ انسانی معاشرہ دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ ایک وہ جو مستقل اقدار حیات کے مطابق ہو۔ اس نہج کے مطابق زندگی بسر کرنے سے تمام کوششیں بارآور ہوتی ہیں اور سامانِ زیست کی فراوانیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اس کی مثال اس تناور درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال تک پہنچی ہوئی ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ اس کے برعکس، دوسرا نظریۂ زندگی انسانوں کا خود ساختہ ہے۔ اس کی مثال اس پودے کی سی ہے جس کی جڑیں زمین کے اوپر ہی اوپر ہوں اور جسے ہوا کا ذرا سا تیز جھونکا اکھیڑ کر پھینک دے۔ اس کے بعد فرمایا کہ

یثبت اللہ الذین اٰمنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا والاٰخرۃ ویضل اللہ الظالمین (۱۴/۲۷)

اللہ اپنے اس محکم قانون کے مطابق، اس قانون پر ایمان رکھنے والی جماعت کو قریبی مفاد کی زندگی میں مستحکم اور استوار رکھے گا اور ان کی مستقبل کی زندگی بھی بڑی خوشگوار ہوگی۔ ان کے برعکس جو قوم حقوق انسانیت میں کمی کریگی اس کی تمام کوششیں رائیگاں چلی جائینگی۔

یہانتک تم دیکھو سلیم! کس طرح ایک محکم اصول اور اٹل قانون کا ذکر ہو رہا ہے جس کے مطابق قوموں کے اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کہدیا کہ

ویفعل اللہ ما یشاء (۱۴/۲۷)

اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

تم دیکھو گے کہ ان دونوں باتوں میں (بظاہر) کوئی ربط نظر نہیں آتا۔ یعنی سلسلۂ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ دنیا میں قوموں کی زندگی اور موت، ان کے عروج اور زوال کیلئے ایک محکم اصول مقرر ہے اور اسی اصول کے مطابق نتائج مرتب ہوتے رہتے ہیں لیکن اس کے

---

[1] ان قوانین کو "مستقل اقدار" کہتے ہیں۔

ساتھ ہی یہ کہدیا کہ "اللہ جو چاہے کرتا ہے"۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اعمال کے نتائج مذکورہ صدر قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ "اللہ جو چاہے کرتا ہے"؟ اور اگر حقیقت یہ ہے کہ "اللہ جو چاہے کرتا ہے" تو پھر اس قانون سے کیا مطلب ہے جس کا پہلے ذکر چلا آ رہا ہے؟ اس سے ذہن میں پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر تم اس نکتہ کو پیش نظر رکھو جسے میں پہلے بیان کر چکا ہوں تو تم دیکھو گے کہ بات بالکل واضح اور مربوط ہے۔ یعنی اللہ نے ایک قانون بنایا ہے کہ اس قسم کے نظریۂ حیات کا نتیجہ یہ ہوگا اور اس قسم کے اندازِ زندگی کا نتیجہ وہ۔ اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ ایسا قانون کیوں بنایا گیا؟ کیوں یہ قاعدہ مقرر کر دیا گیا کہ فلاں قسم کے معاشرہ کا مآل یہ ہوگا اور فلاں قسم کے نظامِ زندگی کے عواقب یہ ہوں گے؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ تم یہ سوال اٹھا نہیں سکتے۔ اسلئے کہ کائنات اور انسانی زندگی سے متعلق تمام قوانین اس گوشے میں متعین ہوتے ہیں جہاں خدا کا مطلق اختیار و ارادہ کام کرتا ہے۔ یہ ہے مقصود "و یفعل اللہ ما یشاء" سے۔ یعنی یہ قانون سازی خالص خدا کی مشیت کے مطابق ہوتی ہے۔ اس میں "کیوں" کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

یہ تو پھر بھی وہ قوانین ہیں جو مستقل اقدار کہلاتے ہیں اور جن کا تعلق کائنات اور انسانی زندگی کی بنیادوں سے ہے۔ اسلئے ان قوانین کے اصول کے متعلق یہ سوال ہی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسے کیوں ہیں۔ دنیا کے عام علوم کے بنیادی قواعد کی بھی یہ حالت ہے کہ وہ قواعد و ضوابط کی پابندیوں سے ماورا رہتے ہیں۔ مثلاً علم ریاضی کو دیکھو جو سرتاسر قاعدے اور ضابطے پر متفرع ہوتا ہے۔ اس میں اقلیدس کے بنیادی قواعد کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اقلیدس کی پوری عمارت، نقطہ (Point) کی اس تعریف

بنیادی قوانین کے مسلمات

(Definition) پر استوار ہوتی ہے کہ اس کا نہ طول ہوتا ہے نہ عرض۔ نہ وہ حجم رکھتا ہے نہ ضخامت۔ انسانی ذہن کسی ایسی شکل کا تصور نہیں کر سکتا جس کا نہ طول ہو نہ عرض نہ ضخامت اور وہ پھر بھی اپنی پوزیشن رکھے۔ لیکن اگر نقطہ کی اس تعریف کو تسلیم نہ کیا جائے تو جیومیٹری کا علم آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ یا مثلاً یہ اصول کہ مثلث کے تین زاویوں کا مجموعہ ہمیشہ دو قائموں کے برابر ہوتا ہے اور اس کے دو اضلاع مل کر ہمیشہ تیسرے ضلع سے بڑے ہوتے ہیں۔ اگر آپ کسی بڑے سے بڑے ریاضی داں سے پوچھیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے تو وہ اس کا جواب کبھی نہیں دے سکتا۔ حالانکہ وہی کہے گا کہ تم خود امتحان کر کے دیکھ لو کہ ایسا ہوتا ہے یا نہیں۔ یا مثلاً حساب کا یہ اصول کہ کسی عدد کا دگنا ہمیشہ جفت ہوتا ہے اسلئے تو اعداد سے بھی پوچھو کہ ایسا کیوں ہوتا ہے تو وہ کچھ نہیں بتا سکے گا۔ ان قواعد کو (Postulates) کہتے ہیں جنھیں بالضرور تسلیم کرنا ہوتا ہے یہ ہے وہ دنیا جہاں قانون اور ضابطہ کسی ضابطہ اور قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ جہاں کوئی شخص "کیوں" کا جواب نہیں دے سکتا۔ جہاں "قانون متعین کرنے والے" خدا سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟

لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون (۲۱/۲۳)

اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اس کے سوا اور سب سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔

(کیونکہ کائنات اور زندگی کے مستقل قوانین و اقدار اسی کے متعین کردہ ہیں)

یہ ہے سلیم! وہ گوشہ جہاں خدا، مطلق العنان، خود مختار حیثیت سے بلا کسی ضابطے اور پابندی کے، اپنی مشیت (مرضی) کے مطابق

جس طرح جی چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس گوشہ میں اس کا امر اس طرح کارفرما ہوتا ہے کہ اذا اراد شیئ فیقول لہ کن فیکون۔ بس اس کا ارادہ ہوا اور وہ شے موجود ہو گئی۔ اس گوشہ کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں ہو سکتا ہے کہ یہ کیسے ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے۔

دوسرا گوشہ۔ خارجی کائنات

اب اس سے آگے بڑھو سلیم! اور اس گوشہ میں آجاؤ جہاں ہماری محسوس کائنات سرگرم عمل ہے۔ یہاں کیا کیفیت ہے؟ خدا نے اپنی مشیت کے مطابق کائنات کو پیدا کر دیا اور اپنی مشیت ہی سے وہ قوانین بنا دیئے جن کے مطابق اشیائے کائنات نے اپنے فرائض مفوضہ ادا کرنے ہیں۔ یہ کائنات خدا ہی کے امر سے سرگرم عمل ہے لیکن اب خدا کے امر کی کیفیت بدل گئی۔ وہی امر جو پہلے گوشے میں بلا کسی ضابطے اور پابندی کے کارفرما تھا اب ضابطوں کے پیمانوں میں گھر گیا۔ قرآن کے الفاظ میں

وکان امر اللہ قدرا مقدورا (۳۳/۳۸)

خدا کا امر مقررہ اندازوں کا پابند ہو گیا۔

اب ہر شے کے لئے ایک ضابطہ مقرر ہو گیا۔

قد جعل اللہ لکل شئ قدرا۔ (الطلاق)

اللہ نے ہر شے کے لئے ایک پیمانہ مقرر کر دیا۔

اسی کو قرآن نے سنۃ اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی "خدا کی روش"۔ "خدا کا قانون" اور سنت اللہ کے متعلق بتا دیا کہ اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو گی (ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ۳۳/۶۲) نہ ہی وہ اپنی سمت بدلے گی (ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا ۳۵/۴۳) غور کرو سلیم! وہی خدا جس نے کہا تھا کہ یفعل ما یشاء (وہ جیسا چاہتا ہے کرتا ہے) اور یحکم ما یرید (جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے) اب یہ کہہ رہا ہے کہ تم ہمارے قانون میں تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ تم سوچو کہ یہ کتنی بڑی پابندی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیار مطلق پر عائد کر لی ہے! یعنی (SELF-IMPOSED RESTRICTION) اب وہی امر جو پہلے گوشے میں خالصۃً مشیت تھا، ایک غیر متبدل قانون بن گیا۔ اس دوسرے گوشے میں امر، اذن، مشیت (ما یشاء اور کیف یشاء) کے معنی قانونِ خداوندی کے ہو جائیں گے۔ مثلاً سورۂ نحل میں ہے

وسخر لکم اللیل والنہار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ (۱۶/۱۲)

اس نے رات اور دن اور سورج اور چاند اور ستاروں کو اپنے قانون کی زنجیر میں جکڑ دیا تاکہ تم ان سے کام لے سکو۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام قوانین غیر متبدل ہیں اور ان کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علم الافلاک (ASTRONOMY) کی اسقدر عظیم المرتبت اور محیر العقول عمارت اسی بنیاد پر استوار ہے کہ نظام فلکی ایک لگے بندھے قانون کے مطابق چل رہا ہے اور اس میں کہیں، کبھی ذرہ برابر بھی تبدیلی

لہ معجزات کی حقیقت کے متعلق "معراج انسانیت" باب معجزات دیکھئے۔

نہیں ہوتی۔ اسی لئے آیۂ مندرجہ صدر کے بعد فرمایا ان فی ذالک لاٰیٰت لقوم یعقلون (۲۴-۶) یقیناً یہ حقیقت کہ آسمان کے اسقدر عظیم الجثہ کرّے کس طرح قانونِ خداوندی کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں، ان لوگوں کے لئے اپنے اندر نشانیاں رکھتی ہے جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں۔ یہ تو خیر "آسمان" کی باتیں ہیں۔ اسی امر کے متعلق اس نے دوسری جگہ کہا ہے والفلک تجری فی البحر بامرہ (۲۲-۶۵) سمندر میں جہاز بھی اسی کے امر کے مطابق چلتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جہاز اور کشتیاں ایک خاص اصول کے مطابق چلتی ہیں جس کی بنیاد اس اٹل قانون پر ہے کہ اتنے وزن اور حجم کی چیز پانی کے اوپر تیرتی رہے گی اور اس سے زیادہ وزن کی چیز ڈوب جائے گی۔ یہ قانون ایسا محکم اور ناقابل شکست ہے کہ کشتیوں کے ملاح اور جہازوں کے کپتان اس حساب کے مطابق آنکھیں بند کرکے بوجھ لاد لیتے ہیں اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اس قانون پر ان کا اعتماد دغا دے جائے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں توکل علی اللہ کہتے ہیں۔ یعنی قانونِ خداوندی کے محکم، اٹل اور غیر متبدل ہونے پر کامل اعتماد۔ اس کے ناقابل شکست ہونے پر پورا پورا بھروسہ۔ سارا نظامِ کائنات اسی توکل (بھروسہ) پر چل رہا ہے۔ اگر یہ قانون دھوکہ دے جانے والا ہو تو انسان دنیا میں ایک قدم بھی نہ اٹھا سکے۔

امر کے معنی قانون

یا مثلاً دوسری جگہ ہے:۔

هو الذی یصورکم فی الارحام کیف یشاء (۳-۶)

اللہ وہ ہے جو رحمِ مادر کے اندر تمہاری صورت گری کرتا ہے "جس طرح چاہتا ہے"۔

یہاں بھی ظاہر ہے کہ کیف یشاء (جس طرح چاہتا ہے) سے مراد وہ قانونِ خداوندی ہے جس کے مطابق جنین کے پیکر میں مختلف تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ علم الحیات (BIOLOGY) کے ماہرین اس قانون کی جزئیات تک کا علم حاصل کرتے جارہے ہیں اور آنے والی نسلوں میں عجیب و غریب تخلیقی تبدیلیوں کے تجربات کر رہے ہیں۔

اسی طرح امراض بھی اس کے قانون کے مطابق آتے ہیں اور ان کا علاج بھی اسی کے مطابق ہوتا ہے۔ زندگی بھی اس کے قانون کے مطابق ملتی ہے اور موت بھی اسی کے قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ ان مقامات میں امر، اذن، مشیت وغیرہ کا مفہوم بالکل واضح ہے حتیٰ کہ اس گوشہ میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ "یہ اللہ نے کیا" یا "اللہ ایسا کرتا ہے" تو اس کے معنی بھی یہ ہیں کہ اس طرح اللہ کا قانون کرتا ہے جب حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا "اللہ وہ ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے (۲۶-۸۰) تو وہاں خدا کے قانون ہی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔

ہر شے کی تقدیر

اس گوشے میں ایک چیز اور بھی قابل غور ہے۔ اشیائے کائنات میں سے ہر ایک کے لئے ایک قانون مقرر ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں اس شئے کی تقدیر کہتے ہیں۔ یعنی اس شئے کے خواص و اثرات کا پیمانہ۔ یہ قانون اٹل ہے (یعنی ہر شئے کی تقدیر مقرر ہے) اور کسی چیز کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ اپنی اس تقدیر کو بدل لے۔ ہر شئے قانونِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے (یسبح للہ ما فی السموٰت والارض) پانی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ سیال ہے۔ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ اپنی سطح ہموار رکھتا ہے۔ جس برتن میں ڈالئے اس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک خاص درجۂ حرارت پر پہنچ کر منجمد ہو جاتا ہے اور ایک خاص سطح حرارت پر بھاپ

بن جاتا ہے۔ وہ اس کا اختیار نہیں رکھتا کہ اپنے ان خواص (تقدیر) میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے۔ وہ اپنی تقدیر کی حد سے باہر نہیں جا سکتا۔ اس کا دائرۂ عمل اسی کے اندر اندر ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے قل کل یعمل علی شاکلتہ ان سے کہدو کہ ہر شے اپنی اپنی مشاکلت کے مطابق کام کرتی ہے۔ شِکال (TETHER) کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ رسّی جس سے جانور کو باندھا جاتا ہے اس کا کھونٹا اس رسّی کا مرکز ہوتا ہے اور اس رسّی کی لمبائی آخری حد ہوتی ہے جس تک وہ جانور جا سکتا ہے۔ اس حد بندی کو مشاکلت کہتے ہیں۔ یہ مشاکلت، خدا کا قانون ہے۔ یہ اشیاء کی تقدیر ہے۔

تیسرا گوشہ۔ انسانی دنیا

اب سلیم! تم تیسرے گوشے کی طرف آؤ۔ یعنی انسانوں کی دنیا۔ جہانتک خدا کے قانون کا تعلق ہے وہ اس گوشے میں بھی اسی طرح محکم اور غیر متبدل طریق پر کام کرتا ہے جس طرح خارجی کائنات میں۔ لیکن جہانتک انسان کا تعلق ہے، اس میں اور خارجی کائنات کی اشیاء میں ایک بنیادی فرق ہے۔ تم دیکھ چکے ہو کہ اشیائے کائنات اس کا اختیار نہیں رکھتیں کہ وہ جو نسا راستہ چاہیں اختیار کریں۔ وہ مجبور ہیں۔ لیکن انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنا راستہ آپ تجویز کرلے۔ انسان سے کہدیا گیا ہے کہ من شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر۔ جس کا جی چاہے ایمان کی راہ اختیار کرلے اور جس کا جی چاہے کفر کے راستے پر چل پڑے۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ یہ فرق کتنا بڑا فرق ہے۔ گوشۂ اول میں خدا کا اختیار مطلق کام کرتا تھا۔ وہاں مایشاء (جس طرح چاہے) خدا کے لئے تھا۔ گوشۂ دوم میں، خدا کی یہ مشیت مقدور ہوگئی۔ یعنی مقررہ پیمانوں کے اندر گھر گئی اور ہر شئے کے لئے ایک پیمانہ (تقدیر) مقرر ہوگیا۔ یعنی قانون بھی مجبور ہوگیا کہ وہ مقررہ اصولوں کے مطابق نتائج پیدا کرے اور اشیائے کائنات بھی مجبور ہوگئیں کہ وہ مقررہ قانون کی پابندی کریں۔ اس گوشے میں اختیار کسی کو بھی نہ رہا۔

لیکن اس تیسرے گوشے میں خدا کا قانون تو اپنے غیر متبدل ہونے پر پابند رہا لیکن انسان کو اختیار مل گیا کہ وہ جو نسا راستہ جی چاہے منتخب کرلے۔ اب "مشیت" (جس طرح جی چاہے) انسان کی طرف لوٹ آئی۔ اب اس سے کہدیا کہ "اعملوا ما شئتم (۴۱/۴۰) جیسا تمہارے جی میں آئے کرو۔ جیسی تمہاری "مشیت" (مرضی) ہو تم کرو۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ قرآن کی رو سے

انسان کا مقام!

انسان کا مقام کیا ہے؟ "اعملوا ما شئتم" گوشۂ اول میں خدا کے لئے تھا۔ دوسرے گوشے میں کسی کیلئے بھی نہیں تھا۔ اور اب تیسرے گوشے میں انسان کے لئے ہے۔ یہ دوسری پابندی ہے جو خدا نے اپنے اختیار مطلق پر خود عائد کرلی ہے اور اس میں بھی وہ اپنے "اصول" کا ایسا پکا ہے (اور اللہ سے زیادہ وعدے کا پکا کون ہو سکتا ہے) وعد اللہ حقا ومن اصدق من اللہ قیلا (۴/۱۲۲) کہ جس طرح اپنا قانون نہیں بدلتا اسی طرح انسان کے اختیار میں بھی دخل نہیں دیتا۔ اگر اسے دخل دینا ہوتا (یعنی انسان کا اختیار سلب کرلینا ہوتا) تو اسے اختیار دیتا ہی کیوں؟ انسان کو صاحب اختیار بنانا بھی "خدا کا قانون" ہی ہے اور اس کا قانون کبھی بدلا نہیں کرتا۔

لیکن انسان کے اس اختیار کے ساتھ ہی ایک جبر کا پہلو بھی ہے۔ اسے اس کا تو اختیار ہے کہ دو راستوں میں سے جو راستہ جی چاہے

اختیار کرلے۔ لیکن اسے اس کا اختیار نہیں ہے کہ جو راستہ اس نے اختیار کیا ہے اس کے نتائج بھی خود ہی مرتب کرلے۔ اس کے نتائج خدا کے اٹل قانون کے مطابق مرتب ہوں گے۔ مثلاً کسی شخص کے سامنے میز پر مصری کا ٹکڑا اور سنکھیا کی ڈلی رکھی ہے۔ یہ اس کے اختیار میں ہے کہ چاہے مصری کا ٹکڑا منہ میں ڈال لے اور چاہے سنکھیا کی ڈلی۔ لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے کہ نگل تو لے سنکھیا کی ڈلی اور یہ چاہے کہ اس سے نتیجہ مرتب ہو مصری کے ٹکڑے کا۔ یہ نتیجہ خدا کے قانون کے مطابق مرتب ہوگا جس پر انسان کو کوئی اختیار نہیں۔ اسلئے جہاں یہ فرمایا کہ اعملوا ما شئتم (جس طرح تمہارا جی چاہے کرو) اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ انہ بما تعملون بصیر (۴۱/۴۰) خدا کا قانون اچھی طرح دیکھ رہا ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ عمل کا انتخاب تو تمہارے اختیار کی چیز ہے لیکن اس کا نتیجہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ تم خدا کے قانون کی گرفت سے باہر نہیں جا سکتے۔ ان بطش ربک لشدید۔

تم نے سمجھا سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ کائنات میں خدا کے بے شمار قوانین (تقدیرات) بکھرے پڑے ہیں۔ یہ انسان کی مرضی پر ہے کہ جس قسم کا قانون (تقدیر) چاہے اپنے لئے اختیار کرلے۔ بالفاظِ دیگر انسان جس قسم کا خود بن جائیگا، اسی قسم کا قانون اس پر وارد ہو جائیگا یہ جس قسم کی تبدیلی اپنے اندر پیدا کرلے گا، اسی قسم کا قانون اس پر نافذ العمل ہو جائے گا۔ (اسی قسم کی اس کی تقدیر ہو جائے گی۔ یہاں

انسان کی تقدیر

سر رشتۂ اختیار (INITIATIVE) انسان کے ہاتھ میں ہے اور خدا کا قانون اس کے اختیار کی اتباع کرتا ہے (اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے) مثلاً قرآن میں ہے کہ فلما ازاغوا ازاغ اللہ قلوبھم (۶۱/۵) جب انہوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کر لیا تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا" یعنی جیسا راستہ انہوں نے اختیار کیا اسی کے مطابق خدا کا قانون ان پر منطبق ہو گیا۔ دوسری جگہ ہے یؤفک عنہ من افک (۵۱/۹) اس (صحیح راہ) سے اسی کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھر جاتا ہے یعنی جو کچھ تم کرتے ہو اس کے مطابق ہمارا قانون عمل پیرا ہو جاتا ہے۔ یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء۔ جو شخص ہلاکت اور تباہی سے محفوظ رہنا چاہتا ہے، اسے ہمارا قانون سامانِ حفاظت عطا کر دیتا ہے۔ جو تباہ ہونا چاہتا ہے اسے ہمارے قانون کی رو سے تباہی آجاتی ہے جو شخص جیسا چاہتا ہے ویسا ہی ہمارا قانون کر دیتا ہے جو جیسا بن جاتا ہے اسی کے مطابق اس کی تقدیر بن جاتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں

حرفے بارکیش بہ رمزے مضمر است　　تو اگر دیگر شوی او دیگر است
خاک شو نذرِ ہوا سازد ترا　　سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی! افتندگی تقدیر تست　　قلزمی! پائندگی تقدیر تست

جب حقیقت یہ ہے کہ انسان جس قسم کا خود بن جائے اسی قسم کی اس کی تقدیر بن جاتی ہے (یعنی تقدیر انسان کے فیصلے اور عمل کو FOLLOW کرتی ہے) تو پھر تقدیر کا رونا کس لئے؟

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں　　تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

اگر تم کسی ایک حالت میں ہو اور اس کے مطابق قانونِ خداوندی کے نتائج تمہارے لئے ناخوشگوار ہیں، تو تم اپنے اندر تبدیلی پیدا کرلو

اس سے خدا کا دوسرا قانون (تقدیر) تم پر منطبق ہو جائے گا۔

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر　　خواہ از حق حکم تقدیرے دگر

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست　　زانکہ تقدیرات حق لا انتہا است

تمہیں سلیم! حضرت عمرؓ کا وہ واقعہ یاد ہوگا کہ جب ایک جگہ طاعون پھیلا تو آپ نے کہا کہ اس بستی کو چھوڑ کر فوراً باہر جنگل میں چلے جانا چاہئے اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا کہ افرار من قدر اللہ کیا آپ خدا کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا نعم افر من قضاء اللہ الی قضاء اللہ۔ ہاں! میں خدا کی تقدیر سے بھاگ کر خدا ہی کی تقدیر کی طرف جا رہا ہوں۔ اس سے سلیم! وہی مفہوم ہے جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست　　زانکہ تقدیرات حق لا انتہا است

مشیت سے مراد قانونِ خداوندی ہے

ان تصریحات کی روشنی میں سلیم! اب تم قرآن کے ان مقامات کو دیکھو جہاں یہ کہا گیا ہے کہ مصائب و تکالیف خدا کے حکم سے آتی ہیں۔ تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ وہاں حکم (امر، اذن، مشیت) سے مراد قانونِ خداوندی ہی ہے۔ مثلاً جب جنگ احد میں مسلمانوں کے لشکر کو نقصان اٹھانا پڑا تو اس کے متعلق فرمایا کہ

وما اصابکم یوم التقی الجمعان فباذن اللہ (۳/۱۶۵)

کہ دونوں فوجوں کے تصادم کے دن جو واقعہ پیش آیا وہ اللہ کے اذن سے ہوا تھا۔

اب دیکھو سلیم! کہ قرآن نے اس اذن (حکم) کی وضاحت کس طرح فرمائی ہے اس سے متصل (سابق) آیت میں ہے کہ اس واقعہ پر تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ مصیبت کیسے آئی؟

قلتم انّٰی ھذا (۳/۱۶۵)

تم نے کہا کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی؟

اب اس کا جواب سنو

قل ھو من عند انفسکم

ان سے کہدو کہ یہ مصیبت خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔

اور کہاں سے آگئی ہے؟ اور اس کے بعد فرمایا کہ

ان اللہ علیٰ کل شیٔ قدیر (۳/۱۶۵)

اللہ نے اپنے قانون کے مطابق تمام اشیاء کے اندازے مقرر کئے ہوئے ہیں۔

ہر عمل کا نتیجہ مقرر ہے۔ اسی کے مطابق یہ مصیبت بھی آئی ہے۔ یہ ہے سلیم! باذن اللہ (اللہ کے حکم سے) قرآن کا مفہوم۔ اسی طرح سورۂ توبہ میں ہے کہ

قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا۔ (۹/۵۱)

ان سے کہدو کہ ہم پر کوئی مصیبت نہیں آسکتی (کوئی واقعہ پیش نہیں آسکتا) بجز اس کے جو اللہ نے ہمارے لئے مقرر کر دیا ہے"۔

بلکہ عام ترجمے کے مطابق ۔۔۔ جو کچھ اللہ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے)۔ لیکن دوسری جگہ اس کی وضاحت یوں کر دی کہ

وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم (۴۲/۳۰)

جو واقعہ بھی پیش آتا ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا ہوتا ہے۔

تمہارے حوادث خود تمہارے فیصلوں اور اعمال کی تخلیق ہوتے ہیں ۔۔۔ اسی طرح حکومت و مملکت کے متعلق ایک جگہ فرمایا کہ

ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ (۷/۱۲۸)

مملکت خدا کی ہے وہ اسے اپنے بندوں میں سے "جسے چاہے" دیدیتا ہے۔

لیکن دوسرے مقام پر اس کی وضاحت کر دی کہ "جسے چاہے" سے مراد کیا ہے۔ فرمایا کہ

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (۲۱/۱۰۵)

مملکت انہی بندوں کو ملتی ہے جو اس کی صلاحیت[1] رکھتے ہیں۔

تم نے دیکھا کہ من یشاء کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ نہیں کہ جسے خدا دینا چاہے۔ اس کے معنی ہیں کہ یہ اس کو ملتی ہے جو اسے خدا کے قانون کے مطابق حاصل کرنا چاہے۔ من یشاء (جو چاہے) میں "مشیت" (مرضی) انسان کی کارفرما ہوتی ہے۔ مائدۂ ارض پر خدا کی یہ نعمتیں بکھری پڑی ہیں۔ جو انہیں لینا چاہے لے لے۔ جو اٹھانا چاہے اٹھالے۔ اس کیلئے صرف ایک قانون مقرر ہے جو اس قانون کے مطابق عمل کرے گا یہ اس کے حصے میں آجائیں گی۔

ہست ایں میکدہ و دعوت عام است اینجا　　قسمت بادہ باندازۂ جام است اینجا

یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے ہیں

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے سلیم! کہ ان قوانین خداوندی کا علم کس طرح حاصل ہو؟ جن کے مطابق وہ انسانوں کی تقدیریں بنتی ہیں؟ (یا جن کے مطابق انسان اپنی تقدیر بدل سکتا ہے) اس کا ایک طریقہ تو وہی ہے جسے خارجی کائنات کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے یعنی مشاہدات اور تجربات کی رو سے ان قوانین

---

[1] میں نے یہ الفاظ مروجہ ترجموں کے مطابق لکھ دیئے ہیں ورنہ ان کا اصل ترجمہ یہ ہے کہ خدا حکومت و مملکت اس قوم کو دیتا ہے جو قوم اسے خدا کے قانون کے مطابق حاصل کرنا چاہتی ہے۔

[2] جو مملکت غاصبانہ انداز سے ڈاکوؤں کی طرح چھین لی جائے یا باپ سے وراثتاً حاصل کر لی جائے یا کسی سے بطور عطیہ مل جائے اس میں وہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے جو صلاحیت کا نتیجہ ہوتے ہیں (تفصیل کیلئے دیکھئے "وراثت ارض کا ابدی قانون" مطبوعہ طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۵۳ء)

(امرِ الٰہی، یا سنت اللہ) کا علم حاصل کرنا لیکن اس طریق میں ایک تو وقت بہت زیادہ صرف ہوتا ہے اور دوسرے انسانی توانائیاں بے حد ضائع ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ طریق ظن و تخمین کا ہے، حتم و یقین کا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس قدر جانکاہ مشقتوں سے بچانے کے لئے[1] ان قوانین کا علم بذریعہ وحی عطا کر دیا کہ جو انسان چاہیں آسانی سے صحیح راستے کو اختیار کر سکیں۔ اسی کو "امرِ منزل من اللہ" (خدا کی طرف سے نازل شدہ امر کہا گیا ہے) ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗ اِلَيْكُمْ (۶۵/۵)[2] "یہ اللہ کا امر ہے جسے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے"۔ یعنی وہی امر جو گوشۂ اول میں اس انداز سے کارفرما تھا جسے خدا کا اختیارِ مطلق کہا گیا ہے۔ پھر وہ گوشۂ دوم میں "قدرًا مقدورًا" (پیمانوں کے حدود میں گھرا ہوا) بن کر اس طرح نافذ ہوا کہ کسی شئے کو اس سے مجالِ سرتابی نہیں ہے۔ اب گوشۂ سوم میں وحی خداوندی کی حیثیت سے قرآن کے غیر متبدل کلمات (قوانین) بن کر ایں نمط سامنے آیا کہ جس کا جی چاہے اسے اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ ایک ہی امر ہے جو گوشۂ اول میں مشیت کہلاتا ہے۔ گوشۂ دوم میں اشیائے کائنات کی تقدیر بن جاتا ہے اور گوشۂ سوم میں احکامِ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مؤمن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

مجھے امید ہے کہ تم یہاں تک بات سمجھ گئے ہو گے۔ اب اس پر غور کرو کہ خدا کا امر (جو مختلف گوشوں میں مختلف حیثیتوں سے نافذ العمل رہتا ہے) آخر الامر کرتا کیا ہے؟ اس سے مقصود کیا ہے؟ اس کا فریضہ کیا ہے؟ تم دیکھو گے کہ گوشۂ اول میں امرِ الٰہی، اشیائے کائنات کو وجود میں لاتا ہے، اور ان کے لئے قوانین (تقدیریں) متعین کرتا ہے۔ گوشۂ دوم میں یہی امر (یعنی قوانین) ان اشیاء کو ان کے نقطۂ آغاز سے نقطۂ تکمیل تک پہنچانے کی راہ نمائی کرتا ہے۔ وہ قطرۂ نیساں کو بتاتا ہے کہ وہ کس طرح گہرِ آبدار میں تبدیل ہو جائے۔ وہ ننھے سے بیج کو وہ راستہ دکھاتا ہے جس سے وہ شاہ بلوط کا تناور درخت بن جائے۔ اسی لئے قرآن نے ان تقدیرات (قوانین) کا مقصد یہ بتایا ہے کہ ان کے ذریعہ ہر شئے کو اس کے مقامِ تکمیل (آخری حد) کی طرف راہنمائی ملتی ہے وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (۸۷/۳)۔ "خدا نے ان کے اندازے مقرر کئے ہیں اور وہ (ان کے ذریعے) ان کی راہنمائی کرتا ہے"۔ یہی کچھ امر اللہ (یعنی وحی خداوندی) انسانی دنیا میں کرتا ہے۔ یعنی انسان کیلئے ہدایت (راہنمائی) کا موجب بنتا ہے۔ چنانچہ اَمَرٌ ان پتھروں کو کہتے ہیں جو صحراؤں میں راستہ دکھانے کیلئے رکھ دیئے گئے ہوں۔ امارت، راستہ کی نشان دہی کو کہتے ہیں[3] اس لئے امر کے معنی خدا کی (DIRECTIVE ENERGY) کے ہیں جس سے اشیائے کائنات اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچتی ہیں۔ جب یہی امر وحی کی شکل میں انسانی دنیا میں آتا ہے تو اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کی جائے۔ اگر کاروانِ انسانیت اسی سمت چلے جس طرف وحی الٰہی اشارہ

---

[1] اقبال نے وحی کے متعلق لکھا ہے کہ .... It economises human efforts

[2] قرآن میں متعدد مقامات پر وحی (قرآن) کو امر اللہ کہا گیا ہے۔

[3] یہیں تم سمجھ لو کہ امیر المؤمنین کے کیا معنی ہوئے۔ یعنی جماعت مؤمنین کی راہ نمائی کرنے والا۔ اِئْتَمَرَ کے معنی مشورہ کرنے کے ہیں۔ مؤتمر (کانفرنس) یہیں سے ہے۔ خود شوریٰ کے معنی بھی اشارہ کرنا۔ Suggestion دینا ہے۔

کرتی ہے تو اس کا نتیجہ معاشرہ کا توازن اور ہر قسم کی خوشگواریاں ہوتی ہیں (جنھیں حسنات کہا جاتا ہے) اور اگر اس کے برعکس انسان اپنے خود ساختہ تصورات کے مطابق چلے تو اس کا نتیجہ عدم توازن اور زندگی کی تلخیاں ہوتی ہیں (جنھیں سیئات کہتے ہیں)۔

کل من عند اللہ! اس سے تم اُس آیت کا مفہوم بھی سمجھ لوگے جو اکثر قلوب واذہان کیلئے اس درجہ وجۂ پریشانی بنی رہتی ہے۔ سورۃ النساء میں منافقین کے متعلق کہا ہے کہ جب انھیں خوشگواریاں نصیب ہوتی ہیں تو کہتے ہیں ھذا من عند اللہ "یہ اللہ کی طرف سے ہیں"۔ اور جب کوئی ناگوار بات پیش آجاتی ہے تو رسول اللہ سے کہتے ہیں کہ ھذا من عندک۔ یہ تیری وجہ سے ہوا ہے۔ اس کے جواب میں کہا کہ ان سے کہدو کہ تمہاری یہ تفریق وتمیز خود ساختہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ قل کل من عند اللہ (۴/۷۸)

اس کے بعد فرمایا

ما اصابک من حسنۃ فمن اللہ وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک۔ وارسلنٰک للناس رسولا۔ (۴/۷۹)

اس کا عام ترجمہ یہ ہے:

جو کچھ تمہیں اچھی بات پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو کچھ تکلیف پہنچتی ہے وہ تیری اپنی وجہ سے ہے اور ہم نے تجھے لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اوپر یہ کہا گیا ہے کہ قل کل من عند اللہ (ان سے کہدو کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے) اور دوسری آیت میں کہا گیا ہے کہ جو حسنات آتی ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں اور جو سیئات آتی ہیں وہ تیری طرف سے ہوتی ہیں۔ اسلئے ان دونوں آیتوں میں بہت بڑا تضاد دکھائی دیتا ہے۔ لیکن سلیم! اگر تم ان آیتوں پر ان تصریحات کی روشنی میں غور کرو جو اوپر گذر چکی ہیں، تو ان میں کوئی تضاد نظر نہیں آئے گا۔ پہلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ حسنات تو خدا کی طرف سے آتی ہیں اور سیئات رسول اللہ کی وجہ سے آتی ہیں۔ حسنات اور سیئات دونوں خدا کے قانون کے مطابق واقع ہوتی ہیں۔ اس کے بعد (دوسری آیت میں) اس کی وضاحت کردی کہ یہ قانون کیا ہے؟ قانون یہ ہے کہ اگر تم مرضی الٰہی کے مطابق چلتے جاؤ تو اس کا نتیجہ حسنات ہی حسنات ہوگا۔ (ما اصابک من حسنۃ فمن اللہ) لیکن اگر وحی کی راہنمائی چھوڑ کر اپنے خود تجویز کردہ راستوں پر چلنے لگو تو اس کا نتیجہ زندگی کی ناخوشگواریاں (سیئات) ہوگا۔ (وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک) یہ ہے اس قانون کی تشریح جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ باقی رہے محمدؐ۔ سو ان کا منصب قانونِ خداوندی کو لوگوں تک پہنچا دینا ہے، اعمال کے نتائج مرتب کرنا نہیں۔ یہ کام صرف قانونِ خداوندی کی رو سے ہوتا ہے۔ قرآن میں دیگر مقامات میں اس کی تصریح موجود ہے کہ سیئات انسانوں کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔ مثلاً سورۂ روم میں ہے کہ

وان تصبھم سیئۃ بما قدمت ایدیھم اذا ھم یقنطون (۳۰/۳۶)

جب انھیں اپنے خود کردہ اعمال کی وجہ سے سیئات پہنچتی ہیں تو یہ مایوس ہو جاتے ہیں

اسی کو (۴۲/۴۸) میں بھی دہرایا گیا ہے اور سورۂ انعام میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے ہٹ کر دوسری راہ اختیار کر لیتے ہیں انھیں سوء العذاب (زندگی کی ناخوشگواریوں کا عذاب) پہنچتا ہے (۶/۱۵۸) لہٰذا سورۂ النساء کی اس آیت کے معنی واضح ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ حسنات خدا کے قانون کی متابعت سے (من عند اللہ) ملتی ہیں اور سیئات، اس کے قانون سے ہٹ کر خود تجویز کردہ راہوں پر چلنے سے (من نفسك) اور یہ سب کچھ اللہ کے قانون کے مطابق ہوتا ہے (کل من عند اللہ)۔

تم نے یہاں تک دیکھ لیا سلیم! کہ

(i) ایک گوشہ وہ ہے جہاں خدا کا امر اپنے اختیارِ مطلق کے مطابق جس طرح جی چاہتا ہے کام کرتا ہے۔ یہ وہ گوشہ ہے جہاں کائنات کی ابتدا ہوتی ہے، اور کائنات اور انسانی زندگی سے متعلق تمام قوانین مرتب ہوتے ہیں۔ یہ مشیتِ خداوندی کا گوشہ ہے جسے نہ ہم سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے متعلق سوال کر سکتے ہیں۔

(ii) دوسرا گوشہ وہ ہے جہاں خدا کا امر، قانون کے پیمانوں میں ڈھل کر مختلف اشیائے کائنات کی تقدیر بن جاتا ہے۔ اس گوشے میں کسی شے کو اختیار نہیں ہوتا کہ اس قانون سے سرتابی کر سکے۔ یہاں ہر شے اپنی اپنی تقدیر کی زنجیر کے ساتھ بندھی ہوتی ہے ——

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے

(iii) تیسرا گوشہ انسانی زندگی کا ہے۔ جہاں خدا کا قانون اپنے مختلف پیمانوں (مقادیر) کو لئے ہوئے موجود رہتا ہے، لیکن یہ چیز انسان کے اپنے فیصلے کی ہے کہ وہ جس قسم کا راستہ چاہے اختیار کر لے۔ جس قسم کا راستہ وہ اختیار کریگا اسی قسم کا قانون اس پر نافذ ہو جائے گا۔ یعنی جس قسم کا وہ خود بن جائے گا اسی قسم کی اس کی تقدیر بن جائے گی۔ اس گوشہ میں سررشتۂ کار، انسان کے اختیار میں ہوتا ہے اور خدا کا قانون اس کے مطابق جاری ہوتا رہتا ہے۔

لیکن یہاں پہنچکر ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے جس کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح حیوانی زندگی کی ہے جس کا تعلق انسان کے جسم سے ہے۔ اس سطحِ زندگی پر تو یہ کیفیت ہے کہ ایک فرد جو کچھ کرتا ہے اس کا نتیجہ (قانونِ خداوندی کے مطابق) فوراً سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً (جیسا کہ پہلے مثال میں بیان کیا جا چکا ہے) ایک شخص کے سامنے مصری کا ٹکڑا اور سنکھیا کی ڈلی رکھی ہے۔ یہ اس کے انفرادی اختیار کی بات ہے کہ چاہے مصری کا ٹکڑا منہ میں ڈال لے اور چاہے سنکھیا کی ڈلی۔ اگر اس نے سنکھیا کی ڈلی کھا لی ہے تو اس کے جسم پر اس کا اثر مرتب ہونا شروع ہو جائے گا اور اس طرح خدا کا قانون اپنا نتیجہ فوراً ظاہر کر دے گا۔

انسانی معاشرہ میں قوانین کے نتائج

لیکن آدمی کی زندگی کی دوسری سطح (یعنی اس کی انسانی زندگی) میں پہنچکر ایک اور ہی چیز سامنے آتی ہے جس خدا کا یہ قانون ہے کہ سنکھیا کا نتیجہ ہلاکت ہے اسی خدا کا یہ قانون بھی ہے کہ ظلم کا نتیجہ ہلاکت ہے (ھل یھلك الا القوم الظالمون ۶/۴۷) ظالموں کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھتی (انہ لا یفلح الظالمون ۶/۲۱) انکی جڑ

کٹ جاتی ہے (فقطع دابر القوم الذین ظلموا ۲۵/۶) لیکن ہم دیکھتے یہ ہیں کہ ظلم کرنے والے دن بدن پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں سامانِ عیش کی فراوانیاں ہوتی ہیں۔ ان کے تمام پروگرام کامیاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے برعکس دیانت دار اور نیکوکار قدم قدم پر ناکام رہتے ہیں۔ ان پر گوشۂ عافیت تنگ ہو جاتا ہے۔ ان کی ساری زندگی مصائب و مشکلات میں گذر جاتی ہے۔ اس سے لازماً یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جس خدا کا اٹل قانون، انسان کی حیوانی زندگی میں اس طرح تیر بہدف انداز سے کارفرما رہتا ہے اس کا اسی قسم کا محکم قانون، انسانی زندگی میں پہنچ کر کیوں اس قدر ناکام رہ جاتا ہے۔ حالانکہ خدا نے بار بار کہا ہے کہ اس کے قانون کی گرفت بڑی سخت ہے۔ کوئی اس کی زد سے باہر نہیں رہ سکتا۔ واللہ غالب علیٰ امرہ (۲۱/۱۲) یہ سوال بڑا اہم ہے اور اس کا اچھی طرح سے سمجھ لینا نہایت ضروری۔

خارجی کائنات میں خدا کا قانون کن قوتوں کے زور پر اور کس اسلوب و انداز سے اپنے نتائج مرتب کرتا ہے۔ اس کا ہمیں علم نہیں)۔ ہمیں اتنا ہی علم ہے کہ یہ قانون ہے اور یہ اس کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن انسانی دنیا میں خدا کا قانون کس طرح نتیجہ خیز ہوتا ہے، اس کے متعلق خدا نے خود ہی وضاحت کر دی ہے، کیونکہ یہ طریق عمل اس طریق سے مختلف ہے جو کائنات میں کارفرما ہے۔

تم دیکھ چکے ہو سلیم! کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لامحدود اختیارات پر سب سے پہلی پابندی اس وقت عائد کی جب اپنے اختیارات (؛) کو مقررہ پیمانوں میں گھیر کر انھیں بطورِ غیر متبدل قوانین، کائنات میں نافذ کر دیا۔

اور دوسری پابندی اس وقت عائد کی جب انسان کو اختیار دیدیا کہ وہ چاہے تو ان قوانین کی اتباع کرے اور چاہے ان سے سرکشی اختیار کر لے۔

اب ایک اور پابندی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ انسانی دنیا میں خدا کے قوانین انسانی معاشرے (نظام) کے ہاتھوں نافذ العمل ہوتے ہیں۔ یہ قوانین نہ تو از خود نافذ العمل ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی ایک فرد کے ہاتھوں۔ ان کا نفاذ معاشرہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ قرآن کے مختلف مقامات میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ اس خط میں استیعاب کی تو گنجائش نہیں لیکن تمہارے سمجھانے کے لئے چند ایک مقامات سامنے لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ غور سے سننا۔ کیونکہ بات بڑی اہم ہے۔

اصولی طور پر انسانی روش کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ، جس میں انسانی معاشرہ خدا کے قوانین کے مطابق قائم ہوتا ہے اور دوسرا وہ جس میں انسان اپنا معاشرہ اپنے خود ساختہ قوانین کی رو سے قائم کرتا ہے۔ قرآن، اول الذکر روش کو ایمان۔ حق۔ عدل اور دین کی روش قرار دیتا ہے اور ثانی الذکر کو کفر۔ باطل اور ظلم وغیرہ کی روش۔ جب کفر اور ظلم کی قوتیں غالب آجاتی ہیں تو وہ ایمان و عدل کی قوتوں کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں تاکہ ان قوانین کے نتائج مرتب نہ ہونے پائیں۔ ان قوتوں کو راستہ سے ہٹانے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ خدا اپنے اختیارِ مطلق سے ان مخالفین کو حوادثِ ارضی و سماوی کے ذریعہ یا بلا کسی ذریعے کے ویسے ہی تباہ و برباد کر دے تاکہ اس کا قانون نتیجہ خیز ہو جائے لیکن یہ اس اصول کے خلاف ہے جس کی پابندی اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارِ مطلق پر عائد کر رکھی ہے۔ اسلئے اس باب میں اصول یہ ہے کہ سرکش قوتوں کی مدافعت خود انسانوں کے ہاتھوں سے کرائی جائے ـــ

خود انسان کے ہاتھوں

سورۃ الحج میں اس حقیقت کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اہلِ مکہ کی مخالف قوتوں نے مسلمانوں کو اس قدر تنگ کیا کہ وہ اپنے گھروں تک سے نکل جانے پر مجبور ہو گئے۔ وہ جب مدینے چلے گئے تو انھوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ انھوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ حق و عدل کا جو نظام یہ جماعت قائم کرنا چاہتی ہے اسے متشکل نہ ہونے دیا جائے۔ اس مقام پر ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اب اس مخالفت کا ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے شمشیر۔ اس لئے تمہیں ان کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ (اذن للذین یقتلون بانھم ظلموا) اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ ان اللہ علی نصرھم لقدیر (۲۲/۳۹) اور نصرانی کی مدد کرنے کیلئے اندازے مقرر کرنیوالا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اللہ کا ارادہ تھا کہ وہ ان لوگوں کی مدد کرتا تو اس کیلئے بہت آسان تھا کہ مخالفین کی قوتوں کو سلب کر لیتا۔ ان پر طوفان بھیج دیتا۔ زلزلے لے آتا۔ انھیں ویسے ہی تباہ کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کے بعد بتا دیا کہ خدا کی یہ نصرت کس طرح آیا کرتی ہے۔ فرمایا کہ

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع و بیع و صلوات و مسٰجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا۔ (۲۲/۴۰)

اگر اللہ انسانوں کے ذریعے دوسرے انسانوں کی روک تھام نہ کرتا رہتا تو کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں، گرجے عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اس کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔

یعنی یہاں اصول یہ کارفرما ہے کہ انسانی قوتوں کی روک تھام انسانوں کے ذریعے ہی کرائی جائے۔ اس لئے وہ جماعت جو قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتی ہے یہ نہ سمجھ لے کہ ان کے مخالف قوتوں کا دفعیہ خدا خود کر دے گا۔ یہ غلط ہے۔ یہاں اصول یہ ہے کہ — ولینصرن اللہ من ینصرہ۔ اللہ کا قانون صرف اسی کی مدد کرے گا جو اس کے نظام کے قیام و استحکام میں مدد دیگا۔ جب مومنین کی جماعت اس طرح قیامِ نظامِ خداوندی کیلئے کوشش کرے گی تو پھر یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ان اللہ لقوی عزیز (۲۲/۴۰) واقعی خدا کا قانون بڑے غلبے اور قوت کا مالک ہے۔ اس غلبہ اور قوت کا مظاہرہ ہوگا اس جماعت کے ہاتھوں جو ملک میں اسلئے تمکن حاصل کریگی کہ یہاں قوانینِ خداوندی کا نفاذ ہو۔ اور اس کے مطابق نظامِ عدل و ربوبیت کا قیام عمل میں آئے۔

[الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور (۲۲/۴۱)]

دوسرے مقام پر (سورۃ محمد میں) پہلے یہ کہا گیا کہ جب فریقِ مقابل میدانِ جنگ میں تمہارے مقابلہ کیلئے نکل آئے تو تم ان سے اس سختی سے لڑو کہ "خود لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے" اور وہیں سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے بعد کہا کہ ولو یشآء اللہ لانتصر منھم۔ اگر ہم چاہتے تو ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ ان مخالف قوتوں کو تمہارے بغیر کسی اور طرح ہی شکست دیدی جاتی لیکن ہم نے ایسا قانون نہیں بنایا۔ قانون یہ ہے کہ انسانوں کی مدافعت خود انسانوں کے ذریعے ہی کرائی جائے (ولکن لیبلوا بعضکم ببعض) لہٰذا اے جماعتِ مومنین یہ سن لو اور اچھی طرح سے یاد رکھو کہ

ان تنصروا اللہ ینصرکم (۴۷/۷)

خدا کا قانون تمہیں غلبہ و نصرت اسی صورت میں دیگا جب تم اس قانون کے غلبہ و نصرت کا ذریعہ بن جاؤ گے۔

جب یہ صورت پیدا ہو جائے گی تو پھر کفر کی سرکش قوتیں نگونسار ہو جائیں گی اور ان کی تمام مخالفتیں رائیگاں چلی جائیں گی۔ (والذین کفروا فتعساً لھم واضل اعمالھم (۴۷/۸))

سورۂ حدید میں اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کر دیا کہ "خدا کے دین کی نصرت" کس طرح کی جاتی ہے۔ فرمایا کہ ہم نے اپنے رسولوں کو علم و بصیرت کے واضح دلائل کے ساتھ بھیجا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ وہ انسانی معاشرہ کو عدل و انصاف کی متوازن بنیادوں پر قائم کریں۔ اس کیلئے انھیں ضوابط و قوانین دیئے۔ اور ان کے ساتھ میزان دی۔ (میزان کی تشریح ذرا آگے چل کر آتی ہے) لیکن مفاد پرست قوتیں محض دلائل و براہین اور قواعد و ضوابط سے مانا نہیں کرتیں اسلئے ان کے ساتھ ہم نے شمشیر خارا شگاف بھی نازل کی تاکہ اس کی سختی نوعِ انسانی کی منفعت کی ضامن بن سکے۔ اس کے بعد فرمایا

ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب (۵۷/۲۵)

اس طرح معلوم ہو سکے گا کہ کون وہ لوگ ہیں جو اس ضابطۂ خداوندی کے اَن دیکھے نتائج پر یقین رکھ کر

خدا کے قانون اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔

یہ ہے وہ طریقہ جس سے یہ حقیقت مشہود ہو سکے گی کہ خدا کا قانون فی الواقع بڑے غلبے اور قوت کا مالک ہے (ان اللہ لقوی عزیز (۵۷/۲۵))

اور آگے بڑھو جب سرکش قوتیں اپنے نظام کو ہر طرح سے مستحکم کر لیتی ہیں تو وہ قانونِ عدل و ربوبیت کی کوئی پیش نہیں چلنے دیتیں اور دیکھنے والے محسوس کرتے ہیں کہ خدا کا قانون بیکس و بے چارہ بن کر رہ گیا ہے۔ سورۂ انفال میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے

ولا یحسبن الذین کفروا سبقوا۔ انھم لا یعجزون (۸/۵۹)

دیکھنا! ایسا نہ ہونے پائے کہ مخالف قوتیں یہ خیال کرنے لگ جائیں کہ وہ ہمارے قانون کی گرفت سے آگے نکل چکی ہیں۔ وہ اب اس قانون کے قابو ہی نہیں آسکتیں! یہ حقیقت دنیا پر واضح ہو جانی چاہئے کہ وہ ہمارے قانون کو عاجز و ناتواں نہیں بنا سکتیں اس کیلئے تم یہ کرو کہ

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ

وعدوکم واٰخرین من دونھم لا تعلمونھم۔ اللہ یعلمھم۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۸/۶۰)

"تم ان کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رہو۔ اپنے امکان بھر سامان قوت پیدا کر کے اور جنگی گھوڑے تیار رکھ کر تاکہ تم ان کے ذریعے اپنے دشمنوں اور نظامِ خداوندی کے مخالفوں کو خائف رکھ سکو۔ اور ان (سامنے کی مخالف جماعتوں) کے علاوہ اوروں کو بھی جنھیں تم نہیں جانتے، اللہ کو ان کا علم ہے۔" تم نے غور کیا سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ ۔ ۔ یہ کہ اگر تم ان کے مقابلہ کے لئے مستعد نہ رہے اور اپنے اندر اتنی قوت نہ پیدا کی تو پھر خدا کا قانون اپنے نتائج مرتب نہیں کر سکے گا اور مخالفین اپنے اس خیال میں پکے ہو جائیں گے کہ وہ اس قانون کی گرفت سے آگے نکل گئے ہیں۔ خدا ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اور دیکھو، خدا نے بصراحت بتا دیا ہے کہ کائنات میں اس کا یہ قانون جاری و ساری ہے کہ حق (تعمیری نتائج برآمد کرنیوالی اسکیم) کا غلبہ رہتا ہے اور باطل (تخریبی نتائج پیدا کرنے والی اسکیم) ناکام رہتی ہے۔ اسے "احقاق حق اور ابطال باطل" کہتے ہیں۔ یعنی حق کا

ثبت ہونا اور باطل کا مٹ جانا۔ انسانی معاشرہ میں یہ احقاق حق اور ابطال باطل کس طرح ہوتا ہے اس کے متعلق فرمایا کہ ہم مسلمانوں کے لشکر کو بدر کے میدان میں اس لئے لے آئے تھے لیحق الحق ویبطل الباطل (۸/۸) تاکہ احقاق حق اور ابطال باطل ہو جائے اسلئے کہ یرید اللہ ان یحق الحق بکلمتہ ویقطع دابر الکافرین (۸/۷) اللہ چاہتا تھا کہ اس کے قانون کے مطابق حق ثبت ہو جائے اور مخالف قوتوں کی جڑ کٹ جائے۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ خدا کا وہی ارادہ جس کی (گوشۂ اول میں) شان یہ تھی کہ جونہی ارادہ پیدا ہوا وہ شے فوراً ظہور میں آگئی (اذا اراد شیئ فیقول لہ کن فیکون) اب کس طرح پورا ہوتا ہے؟ اب وہ پورا ہوتا ہے بکلمتہ یعنی اس کے قانون کی رو سے۔ اور اس کا قانون یہ ہے کہ خدا کے ارادے کو پورا کرنے کا تہیہ رکھنے والی جماعت پوری پوری قوتوں کے ساتھ ہر وقت تیار رہے اور جب ضرورت پڑے مخالفین کی قوت کی مدافعت کیلئے میدان جنگ میں آنکلے۔

دوسری جگہ کہا کہ مسلمانوں کے اس لشکر کو اسلئے میدان میں لایا گیا تھا لیقضی اللہ امرا کان مفعولا (۸/۴۲) تاکہ خدا کا وہ امر پورا ہو جائے جسے وہ پورا کرنا چاہتا تھا۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ خدا کا وہی امر جس کی گوشۂ اول میں یہ کیفیت تھی کہ (فیقول لہ کن فیکون) اس نے کہا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔ اب وہی امر کس طرح سے پورا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ اس لشکر کو ہم میدان جنگ میں اسلئے لائے تھے لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحیی من حی عن بینۃ۔ تاکہ دنیا کو اس مستبد معاشرے سے نجات مل جائے جس میں زندگی اور ہلاکت کے فیصلے اندھا دھند ہوتے ہیں اور اس کی جگہ اس نظام کا قیام ہو جائے جس میں ہلاکت بھی دلیل و برہان کے ذریعہ ہوتی ہے اور زندگی بھی آئین و قانون کے مطابق ملتی ہے وان اللہ لسمیع علیم (۸/۴۲) اور اس طرح دنیا دیکھ لے کہ خدا کس طرح سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ (اسکی تشریح بھی آگے چل کر ملے گی کہ خدا کی یہ صفات کس طرح اس معاشرے کی رو سے شہود ہوتی ہیں)۔

تم نے دیکھا تھا سلیم! کہ خدا کا دعویٰ یہ ہے کہ واللہ غالب علی امرہ۔ اللہ اپنے امر (قانون) پر غلبہ و اقتدار رکھتا ہے۔ اس نے بتا دیا کہ دنیائے انسانیت میں یہ غلبہ و اقتدار اس جماعت کے ہاتھوں عمل میں آتا ہے جو خدا کے نظام کے قیام کیلئے وجود میں آتی ہے اور جسے وہ حزب اللہ (اللہ کی پارٹی) کہہ کر پکارتا ہے۔ سورۂ مائدہ میں دیکھو وہ کس طرح اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اگر تم نظام خداوندی سے پھر جاؤ گے تو وہ تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا جو ان خصوصیات کی مالک ہو گی جو "خدا کی پارٹی" میں ہونی چاہئیں۔ اور جب تک یہ پارٹی ان خصوصیات کی حامل رہے گی غلبہ و اقتدار اس کا ہم رکاب رہے گا۔ فان حزب اللہ ھم الغلبون (۵/۵۶)۔ سورۃ انفال میں مسلمانوں کی مکی زندگی کی کمزوری و ناتوانی کا ذکر کر کے کہا گیا کہ تم "مستضعفین فی الارض" (کمزور و ناتواں) تھے۔ پھر اللہ نے "اپنی نصرت سے تمہارے لئے سامان تقویت بہم پہنچایا" (۸/۲۶) اور دوسرے مقام پر بتا دیا کہ "خدا کی نصرت سے یہ سامان تقویت خود تمہارے اپنے ہی ہاتھوں سے بہم پہنچا ہوا تھا" جہاں یہ کہا کہ اے مدینہ کے مسلمانو! تمہیں کیا عذر ہے کہ تم نظام خداوندی کے قیام کیلئے جنگ نہ کرو، حالانکہ مکہ کے کمزور و ناتواں مرد، عورتیں اور بچے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ۔ یا اللہ ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے باشندے ہم پر اس طرح ظلم کرتے ہیں اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کسی محافظ و سرپرست کا انتظام کر دے اور کسی یار و مددگار کو بھیج دے۔ (۴/۷۵)

تم نے غور کیا سلیم! کہ کے مظلوم خدا سے فریاد کرتے ہیں کہ ہمیں ان ظالموں کے پنجۂ استبداد سے نجات دے۔ وہ اسے مدد کے لئے پکارتے ہیں۔ وہ اس کے حضور گڑگڑا کر دعائیں مانگتے ہیں تو اس کے جواب میں اللہ میاں کیا کہتا ہے؟ وہ ان سے کچھ نہیں کہتا۔ وہ مدینہ کی جماعت مومنین سے کہتا ہے کہ "تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان کی مدد کیلئے اٹھتے نہیں ہو تم دیکھتے نہیں کہ وہ کس طرح پکار پکار کر تم سے مدد مانگ رہے ہیں۔ تم ان کی پکار نہیں سنتے! اٹھو اور ان کی مدد کرو جو تمہیں مدد کے لئے پکار رہے ہیں"۔ یعنی مکہ کے مظلوم مسلمان اپنی مدد کیلئے اللہ کو پکارتے ہیں اور اللہ تعالیٰ مدینہ کے مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم سنتے نہیں ہو کہ وہ کس طرح پکار پکار کر تمہیں مدد کیلئے بلا رہے ہیں۔ تم ان کی پکار کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ یعنی وہ خدا کو مدد کے لئے پکارتے ہیں تو ان کی پکار کا جواب اس نظام کی طرف سے ملتا ہے جو قوانین خداوندی کی تنفیذ کیلئے مدینہ میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ ان کی امداد کیلئے جاتے ہیں اور انہیں مستبدین مکہ کے ظلم و ستم سے نجات دلاتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان سے یہ فرماتے ہیں کہ تم وہ وقت یاد کرو جب "ہم نے تمہاری مدد کی تھی اور تمہیں حفاظت اور پناہ دی تھی"۔ یعنی پکارا گیا خدا کو اور اس پکار کا جواب ملا اس نظام کی طرف سے۔ اور اس جواب اور امداد کو اللہ نے منسوب کیا اپنی طرف۔ اس سے تم سمجھ گئے ہو گے سلیم! کہ

اس معاشرے کے ذریعے

(i) انسانی دنیا میں خدا کے قوانین کس طرح نافذ العمل ہوتے ہیں؟

(ii) اس طرح کہ وہ نظام جو قوانین خداوندی کی تنفیذ کیلئے قائم ہوتا ہے ان قوانین کے نتائج مرتب کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ انسانی دنیا میں قوانین خداوندی کے نتیجہ خیز ہونے کیلئے ضرورت ہوتی ہے (i) ان قوانین کی —— اور (ii) اس معاشرہ، نظام یا جماعت کی جو ان قوانین کے مرتب (EFFECTIVE) بننے کا ذریعہ ہے۔

اس نظام یا معاشرہ کو کہیں المیزان کہا ہے، کہیں حُکم اور کہیں الدین۔ مثلاً سورۂ حدید (کی جو آیت پہلے نقل کی گئی ہے) میں ہے کہ

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتٰب والمیزان (۵۷/۲۵)

یعنی اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو واضح دلائل دیئے۔ ضابطۂ قانون دیا اور المیزان دی اور اس کے ساتھ شمشیر کی قوت۔ اور سورۂ انعام میں حضرات انبیاء کرام کے تذکار جلیلہ کے بعد فرمایا کہ

اولٰئک الذین اٰتینٰھم الکتٰب والحکم والنبوۃ (۶/۹)

یہ وہ حضرات ہیں جنہیں ہم نے کتاب، حکم و نبوت عطا فرمائی۔

کتاب ضابطۂ قانون کو کہتے ہیں۔ نبوت وہ مقام بلند ہے جہاں سے نبی کی چشم حقیقت بیں ان قوانین کی کنہ و حقیقت سے باخبر ہو جاتی ہے (یہ چیز نبی ہی کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اور اسی لئے یہ نبی اکرم کے ساتھ ختم ہو گئی) تیسری چیز ہے حُکم (حکومت)۔ یعنی وہ نظام جو ان قوانین کی رو سے قائم ہوتا ہے[1]۔ یہی حکومت (نظام) وہ میزان ہوتا ہے جس کے ایک پلڑے میں قوانین خداوندی کے باٹ

---

[1] نبوت تو رسول اللہ کے ساتھ ختم ہو گئی لیکن "کتاب اور حکم باقی رہے" یعنی قرآن کریم بطور ضابطۂ قوانین خداوندی کے اور وہ معاشرہ جسے حکم یا جماعت مومنین یا المیزان کہا گیا ہے۔ ان دونوں کے مجموعہ کا نام تھا الدین۔ اگر ان میں سے ایک چیز بھی باقی نہ ہو تو وہ الدین نہیں ہو گا۔ اگر خالی کتاب باقی ہے اور اس کے ساتھ اس کی قوت نافذہ نہیں تو وہ رسومات کا مجموعہ (مذہب) بن جائے گا۔ اور اگر قوت نافذہ کے ساتھ قرآن نہیں تو وہ سیاست خالص چنگیزی رہ جائے گی۔

ہوتے ہیں اور دوسرے میں اقوام عالم کے اعمال رکھے جاتے ہیں تاکہ ان کی صحیح صحیح قیمت متعین ہو جائے۔ اسلئے خدا نے قرآنی نظام کی حامل جماعت کا منصب یہ بتایا ہے کہ وہ شھداء علی الناس ہوگی یعنی تمام نوعِ انسانی کے اعمال کی نگران یہی نظام وہ پیمانہ بنتا ہے جس سے اقوامِ عالم کے اعمال ماپے جاتے ہیں۔ یہی وہ میزان ہوتی ہے جس میں ان کے سب کارنامے تُلتے ہیں اور ان کا صحیح صحیح "وزن" ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اقبال نے مومن کے متعلق کہا ہے کہ

فطرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے   دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

یہی وہ جماعت ہے جن کے متعلق رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ حسبك الله ومن اتبعك من المومنين (۸/۶۴) "تیرے لئے خدا کا قانون اور وہ جماعت جو تیری پیروی کرتی ہے کافی ہے" اس نظام کو الدین کہا گیا ہے۔ یعنی وہ نظام جو خالصتًہ قوانین خداوندی کے مطابق قائم کیا جائے۔ اس کے قیام کے متعلق مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ قاتلوهم حتى لاتكون فتنة ويكون الدين كله لله (۸/۳۹) ان مخالف قوتوں سے جنگ کرو تا آنکہ معاشرہ میں کوئی ملاوٹ باقی نہ رہے اور نظام (الدین) پورے کا پورا قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہو جائے۔ یہ ہے وہ نظام (الدین) جس کے متعلق فرمایا کہ خدا کو بلانا ہو تو اس کے ذریعہ بلایا کرو۔

هو الحي لا اله الا هو۔ فادعوه مخلصين له الدين۔ الحمد لله رب العلمين (۴۰/۶۵)

وہ خدا ہمیشہ زندہ و پائندہ ہے۔ کائنات میں اس کے سوا کسی اور کا قانون نہیں چلتا۔ اسلئے تم بھی اسی کو پکارو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے نظام (الدین) کو خالص اس کے قوانین کے مطابق متشکل کرو تم جب ایسا کر لوگے تو پھر یہ حقیقت آشکارا ہو کر سامنے آجائے گی کہ اس کا نظام کس قدر مستحق تحسین ہے جو تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کا ذمہ دار بنتا ہے۔

خدا کو کس طرح پکارا جائے؟

ان تصریحات کی روشنی میں تم اس آیت کو سامنے لاؤ جو اس تمام گفتگو کا اصل موضوع تھی۔ وہ پوری آیت یوں ہے:

واذا سألك عبادي عني فاني قريب ۵ اجيب دعوة الداع اذا دعان فليستجيبوا لي
وليؤمنوا بي لعلهم يرشدون ۵ (۲/۱۸۶)

اس کا مروجہ ترجمہ یہ ہے:

اور جب سوال کریں تجھ کو بندے میرے مجھ سے پس تحقیق میں نزدیک ہوں جواب دیتا ہوں پکارنے کا پکارنے والے کو جب پکارتا ہے مجھ کو۔ پس چاہئے کہ قبول کریں حکم میرے کو اور چاہئے کہ ایمان لائیں ساتھ میرے تاکہ وہ بھلائی پائیں۔

یہ لفظی ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ کا ہے۔ ابوالکلام صاحب آزاد نے اپنے خطابیاتی انداز میں اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

اور (اے پیغمبر!) جب میرا بندہ میری نسبت تم سے دریافت کرے (کہ کیونکر مجھ تک پہنچ سکتا ہے تو تم اسے بتلا دو کہ میں) تو اس کے پاس ہوں۔ وہ جب پکارتا ہے تو میں اسکی پکار سنتا اور اسے قبول کرتا ہوں۔ پس (اگر وہ واقعی میری طلب رکھتے ہیں تو) چاہئے کہ وہ میری پکار کا جواب دیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ حصول مقصد میں کامیاب ہوں۔

میں سردست اس فلسفیانہ بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتا سلیم! جسے انگریزی میں TRNSCENDANCE OR IMMANENCE of GOD کہتے ہیں۔ یعنی یہ بحث کہ خدا کائنات کے اندر موجود ہے یا اس سے باہر کسی اور مقام بلند پر مستوی ہے۔ اگر ہم اس پیچیدہ بحث میں الجھ گئے تو مقصد پیش نظر سے دور نکل جائیں گے۔ اس لئے تم اس وقت اصل موضوع تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھو۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے کہتا ہے کہ جب لوگ میرے متعلق دریافت کریں تو ان سے کہدو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ چونکہ ہم ذات خداوندی کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے اس لئے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں کہ وہ چونکہ کائنات میں ہر جگہ موجود ہے اسلئے وہ ہر انسان کے قریب ہے۔ "اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب"۔ اس قرب خداوندی کا نتیجہ کیا ہے؟ اسے اگلے الفاظ میں بتایا گیا ہے یعنی میں ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں جب وہ پکارتا ہے۔ سنتا ہی نہیں بلکہ اسے قبول کرتا ہوں اور اس کا جواب دیتا ہوں۔ تم اپنی زندگی کے ایام گذشتہ پر نگاہ دوڑاؤ سلیم! اور سوچو کہ کیا واقعی ایسا ہوا ہے کہ تم نے جب کبھی خدا کو پکارا ہے اس نے تمہاری پکار کا جواب دیا ہے اور اسے قبول کیا ہے؟ تم کبھی بھی ایسا نہیں کہہ سکتے! اپنے آپ سے آگے بڑھکر تم اور لوگوں سے پوچھو اور سنو کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دیتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ تم ہر روز دیکھتے ہو کہ غریب اور نادار، مظلوم و مقہور، بیکس و ناتواں انسان کس طرح گڑگڑا گڑگڑا کر خدا کو پکارتے ہیں۔ کس قدر الحاح وزاری سے اس کے حضور دعائیں مانگتے ہیں۔ لیکن ان بیچاروں کی کوئی مشکل آسان نہیں ہوتی۔ ان کی ساری عمر انہی مصیبتوں میں کٹ جاتی ہے۔ سلیم! ان فٹ پاتھ پر رینگنے والے انسانوں میں سے کون ایسا ہے جس نے اپنے خدا کو نہیں پکارا ہوگا اور اس سے یہ التجا نہیں کی ہوگی کہ وہ اسے کہیں سر چھپانے کا ٹھکانا دیدے؟ لیکن انھیں ان کی پکار کا جو جواب ملا وہ ان کی حالت سے ظاہر ہے۔

ممکن ہے کہدیا جائے کہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ ہم نے مصیبت کے وقت خدا کو پکارا اور ہماری مصیبت دور ہوگئی یہ ٹھیک ہے۔ ایسے لوگ بیشک ملتے ہیں۔ لیکن سلیم! ایسے لوگ بھی تو ملتے ہیں جو آئے دن یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے سائیں تنگڑ شاہ کے مزار پر جا کر اپنی مراد مانگی۔ سائیں صاحب نے ان کی پکار کو سنا اور ان کی مصیبت دور کردی۔ چنانچہ وہ اپنے دل میں پورا اطمینان رکھتے ہیں کہ سائیں تنگڑ شاہ ہماری پکار کو سنتے ہیں اور ہماری مرادوں کو پورا کرتے ہیں۔ انھیں بھی چھوڑیئے۔ کتنے لوگ ہیں جو کالی ماتا کے مندر میں جا کر پکارتے ہیں اور دل کے کامل سکون کے ساتھ لوٹتے ہیں کہ ان کی پکار سنی گئی اور پھر دوسروں کو بتاتے ہیں کہ کالی ماتا نے ان کی مراد پوری کردی۔ اگر ثبوت اپنے ہی دل کا اطمینان ہے تو پھر ان لوگوں کے دل کا اطمینان اس کی دلیل بن جائے گا کہ سائیں تنگڑ شاہ اور کالی ماتا وغیرہ پکارنے والوں کی پکاروں کو سنتے اور ان کا جواب دیتے ہیں۔ لہذا کسی کا یہ کہنا کہ ہم نے مصیبت کے وقت خدا کو پکارا اور اس نے ہماری مصیبت کو رفع کردیا، آیۂ زیر نظر (اجیب دعوۃ الداع اذا دعان) کے مروجہ مفہوم کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس کے برعکس تم نے اوپر دیکھ لیا ہے کہ جب مکہ کے مظلوم انسانوں نے اپنے خدا کو مدد کیلئے پکارا تو ان کے خدا نے ان کی پکار کا جواب کیسے دیا۔ اور انھوں نے کس طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ واقعی خدا ہمارے قریب ہے اور پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے یعنی خدا کی یہ صفت کہ وہ پکارنے والوں کی پکار کو سنتا اور اسے پورا کرتا ہے اس معاشرہ کے ذریعے مشہود ہوتی ہے جو قانونِ خداوندی

(قرآن) کے مطابق تشکل ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں ہر فرد علی وجہ البصیرت محسوس کر لیتا ہے کہ وہ تنہا نہیں، پورے کا پورا معاشرہ اس کے ساتھ ہے۔ (یعنی اس کا خدا اس کے ساتھ وھو معکم اینما کنتم) وہ ہر فرد سے قریب (EQUI-DISTANT) ہے۔ کوئی فرد، کسی حال میں اور کسی مقام پر اسے پکارے، وہ اس کی پکار کو سنتا ہے۔ اس کا جواب دیتا ہے اور اس کی مدد کو پہنچتا ہے (اجیب دعوۃ الداع اذا دعان) اس میں کبھی خطا نہیں ہوتی۔ یہ وہ آسرا ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا (لا انفصام لھا) تم نے وہ واقعہ سنا ہوگا سلیم! کہ جب حضرت عمرؓ شام کے سفر سے واپسی پر ایک صحرا میں رات بسر کرنے کیلئے رُکے ہیں تو حسب عادت گھومنے کیلئے نکلے تاکہ اگر وہاں کوئی بستا ہو تو اس کی حالت معلوم کریں۔ دیکھا کہ ایک جھونپڑی میں ایک بُڑھیا بیٹھی ہے۔ اس سے پوچھا کہ مائی! تمہارا کیا حال ہے۔ وہ دُکھ سے بھری بیٹھی تھی۔ اس نے دو چار جلی کٹی سنا دیں۔ آپ نے کہا کہ اب تو ملک میں سب لوگ خوش ہیں۔ خلیفہ کا انتظام بہت اچھا ہے۔ اس نے کہا کہ باتیں تو میں نے بھی بہت سنی ہیں۔ یونہی دور کے ڈھول سہاونے ہوتے ہیں۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم نے اپنی مصیبت کا حال خلیفہ تک پہنچایا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے کہا کہ جب خلیفہ کو تمہارا حال ہی معلوم نہیں تو وہ تمہاری مدد کس طرح سے کر دیتا؟ سنو سلیم! کہ اس بڑھیا نے کیا کہا۔ اس نے کہا کہ اگر خلیفہ ایسا انتظام نہیں کر سکتا کہ رعایا کے حالات سے باخبر رہ سکے تو اس سے کہو کہ خدا کے نام پر حکومت کرنے کا دعوے چھوڑ دے! حضرت عمرؓ کی حالت یہ تھی کہ جب بھی اس واقعہ کو دہراتے آنکھوں میں آنسو آجاتے اور کہتے کہ مجھے اس بڑھیا نے بتایا کہ بادشاہت اور خلافت میں فرق کیا ہے۔

اب تم نے سمجھا سلیم! کہ اس معاشرہ میں جو قانون خداوندی کے مطابق تشکل ہوتا ہے کس طرح صفات خداوندی ایک ایک کر کے منعکس ہوتی ہیں۔ یہ معاشرہ درحقیقت خدا کی صفات کی زندہ دلیل ہوتا ہے۔ اسی کے متعلق اقبال نے کہا ہے کہ

گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

جب یہ معاشرہ وجود میں آجاتا ہے تو پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ ظلم اور زیادتی کرنے والے دن بدن پھولتے پھلتے چلے جائیں اور دیانت و امانت کے پیروکار تباہ و برباد ہوتے جائیں۔ اس وقت ایک ایسی میزان قائم ہو جاتی ہے جس میں ہر ایک کے عمل کا ذرہ ذرہ تُلتا ہے ومن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ اور ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ ملتا ہے۔ نہ کسی کی سعی حسنہ رائیگاں جاتی ہے اور نہ ہی کسی کی غلط کارانہ روش قانون کی گرفت سے باہر رہ سکتی ہے۔ اسی معاشرہ میں خدا کی وہ صفات منعکس ہوتی ہیں جن کا تعلق انسانی زندگی اور اس کے مقتضیات سے ہے۔ یہی خدا کی ربوبیت عامہ کا ذریعہ بنتا ہے اور یہی اس کی عالمگیر رزاقیت کا کفیل۔ اسی سے اس کی نصرت، ولایت (سرپرستی) رافت، رحمت کے مظاہرے ہوتے ہیں اور اسی سے اس کی صفات جباریت اور قہاریت کا ظہور ہوتا ہے۔ یہی معاشرہ، نوع انسانی کیلئے المؤمن (امن کا ذمہ دار) ہوتا ہے اور یہی ان کی حفاظت کا ضامن (الحفیظ) یہ خبیر بھی ہوتا ہے اور سمیع بھی۔ علیم بھی ہوتا ہے اور بصیر بھی۔ یہ رقیب (نگرانی کرنے والا) بھی ہوتا ہے اور حسیب (محاسبہ کرنے والا) بھی۔ اسلئے کہ یہ معاشرہ قوانین خداوندی کو عملاً نافذ کرتا ہے اور قوانین خداوندی درحقیقت صفاتِ خداوندی ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس معاشرہ میں افراد کی مضمر صلاحیتوں کی نمود ہوتی ہے اور اس میں

ان کے اختیارات کی وسعتیں بڑھتی ہیں کیونکہ اس میں استبداد و استکراہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور ہر فرد خود بطیب خاطر ان قوانین کو اپنے اوپر منطبق کر کے اس طرح اپنے اختیارات کو ان کے دائرے میں محدود کر لیتا ہے جس طرح خدا نے اپنے اختیارات مطلقہ پر از خود پابندی عائد کر لی ہے۔

تشکیلِ معاشرہ ضروری ہے

اس سے تم نے سمجھ لیا ہوگا سلیم! کہ صفاتِ خداوندی کے مشہود اور قوانین خداوندی کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے اس معاشرہ کا قیام بنیادی شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (میں ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں) وہیں ساتھ ہی یہ کہدیا کہ اس کی شرط یہ ہے کہ فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی (۲/۱۸۶) تم میری دعوت (پکارنے) کا جواب دو۔ یعنی میرے قوانین کو اپنی زندگی کا نصب العین بناؤ اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اس داعی کی پکار پر لبیک کہو جو اس قسم کا معاشرہ بنانے کیلئے اپنی آواز بلند کرے اور اس نظام کا مرکز بنے استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (۸/۲۴) "تم نظامِ خداوندی کے مرکز کی دعوت پر لبیک کہو جو اس چیز کی طرف دعوت دیتا ہے جو تمہیں زندگی عطا کر دیگی"۔ دیکھو سلیم! سورۂ آل عمران میں اس حقیقت کو کیسے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ خدا تمہاری پکار کا جواب اسی صورت میں دے گا جب تم اس نظام کے قائم کرنے والے کی پکار پر لبیک کہو گے۔ سلسلۂ کلام یوں شروع ہوتا ہے کہ

کائنات[1] کی تخلیقی ترکیب اور لیل و نہار کی تکوینی گردش میں ارباب فکر و نظر کیلئے (قانون خداوندی کی ہمہ گیریت کی) کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔ ان ارباب فکر و نظر کیلئے جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے، اللہ کے قانون کو ہر وقت سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیقی ترکیب پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اس گہرے تدبر و تفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کائنات کے نشوونما دینے والے نے اسے تخریبی نتائج کا حامل نہیں بنایا بلکہ اسے تعمیری منازل تک پہنچانے کیلئے بنایا ہے اسلئے کہ یہ چیز اس کے قانون سے بہت بعید ہے کہ وہ اس سارے سلسلے کو تخریب کیلئے پیدا کر دے۔ اس قانون سے وہ اس حقیقت کو بھی سوچتے ہیں کہ انسان کے صحیح اعمال کی کھیتیاں کبھی نذرِ آتش نہیں ہو سکتیں۔ کھیتیاں ان کی جھلستی ہیں جو اس کے قانون کی متابعت نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ سوائے ذلت و رسوائی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کی کھیتوں کو سیراب کرنے والی بارش کہیں سے نہیں آسکتی (۳/۱۸۹-۱۹۱)

اس کے بعد فرمایا کہ

کھیتیاں ثمر بار انہی کی ہونگی جنھوں نے سنا کہ ایک پکارنے والا یہ پکار رہا ہے کہ آؤ! ہم اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کو زندگی کا نصب العین بنالیں۔ انھوں نے اس آواز کو سنا اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور یہ حسین آرزوئیں ان کے سینے میں مچل اٹھیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے اس نظام کے قیام میں، مخالفین کی طرف سے جن باتوں کو ہمارے پیچھے یونہی لگا دیا جاتا ہے ہمیں ان کے مضر رساں نتائج سے محفوظ رکھنا۔ اور ہماری چھوٹی چھوٹی تدبیری ناہمواریوں کے اثرات کو محو کرتے رہنا اور ہماری زندگی کے

[1] قرآن کھول کر ان آیات کو سامنے رکھئے اور پھر ترجمہ پڑھئے۔

پروگرام کو ان لوگوں کی رفاقت سے پورا کرنا جن پر کشادگی کی راہیں کھل چکی ہیں۔

اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اپنے پیغامبروں کے ذریعے جن حسین نتائج کا وعدہ کیا تھا ہمیں ان نتائج سے بہرہ یاب فرما دے اور ایسا نہ کر کہ زندگی کے متوازن دور میں ہم ذلیل و خوار ہو جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تیرا قانون ظہورِ نتائج میں کبھی بدعہدی نہیں کیا کرتا۔ (۳/۱۹۲-۱۹۳)

اس کے بعد ہے کہ (جب انھوں نے اس نظام کے قیام کی آواز پر اس طرح لبیک کہا تو)

فاستجاب لھم ربھم انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثیٰ ..... (۳/۱۹۴)

ادھر سے قانونِ خداوندی نے بھی بڑھ کر آواز دی کہ تم میں سے، مرد ہو یا عورت جو بھی اس قانون کے مطابق کام کرے گا اس کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جائے گی۔

اسلئے کہ تم نے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کر لی ہے جس میں ایک فرد (مرد و عورت) دوسرے کا جزو بن گیا ہے (بعضکم من بعض ۳/۱۹۴)

تم نے غور کیا سلیم! کہ "خدا کس کی پکار کا جواب دیتا ہے" اور اس کا ذریعہ کیا ہے؟ اس کا ذریعہ ہے وہ معاشرہ جو قوانینِ خداوندی کی تنفیذ کے لئے متشکل ہو۔ اور خدا اسی کی پکار کا جواب دیتا ہے جو اس معاشرہ کی آواز پر لبیک کہے۔ جو کسی دوسری راہ پر چلے، اس کی پکار کا جواب نہیں ملتا۔ سورۂ یونس میں دیکھو۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے وہی کچھ کہا جو تم نے مجھے لکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یا اللہ! تم دیکھتے ہو کہ فرعون ظلم و استبداد کا مجسمہ ہے اور اس کی قوم اس فساد انگیز نظام کی حامل۔ لیکن اس کے باوجود انھیں اس قدر شان و شوکت اور دولت و قوت میسر ہے حالانکہ تیرا قانون یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی ثمربار نہیں ہوا کرتی۔ اسلئے تو ایسا کر کہ تیرا یہ قانون محسوس شکل میں سامنے آجائے۔ اس کے جواب میں خدا نے کہا کہ

موسیٰ! ہم نے تم دونوں بھائیوں کی پکار کو سن لیا ہے۔ اب تم نے اس روش پر محکم طور پر قائم رہنا جس کی تمہیں تلقین کی گئی ہے اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنے لگ جانا جنھیں اس قانون کا علم نہیں ہے۔ (۱۰/۸۸-۸۹)

بات واضح ہے کہ اگر تم اس نظام کی تشکیل میں استقامت پذیر رہے جو ہمارے قوانین کی بنیادوں پر متشکل ہوگا تو جو کچھ تم دیکھنا چاہتے ہو وہ نظر آجائے گا۔ لیکن اگر تم نے (بفرضِ محال) دوسرا راستہ اختیار کر لیا تو پھر فرعون اور اس کا فساد انگیز نظام نہیں مٹے گا۔

غلط نظام میں "نیک اعمال"!

اور یہ ظاہر ہے کہ اگر نظامِ خداوندی کے مطابق صحیح معاشرہ قائم نہ ہو تو پھر "نیک افراد" کی "نیکیاں" بھی نتیجہ خیز نہیں ہوا کرتیں۔ وہ بھی غلط نظام کی چکی میں اسی طرح پستے رہتے ہیں جس طرح دوسرے لوگ۔ دیکھو سلیم! قرآن نے اس حقیقت کو کس انداز سے بیان کیا ہے۔ پہلے کہا کہ یا ایھا الذین اٰمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم "اے ایمان والو! تم اپنے نظام کے مرکز کی دعوت پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہارے لئے حیات بخش ہے"۔ اس کے بعد کہا کہ واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ (۸/۲۵) "اس تباہی سے بچتے رہو جس کے شعلے صرف انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتے جو زیادتی کرتے ہیں" اس کی لپٹ ہمہ گیر ہوتی ہے اور اچھے اور

بُرے سب اس کی لپیٹ میں آجایا کرتے ہیں۔

یہ نتیجہ ہوتا ہے سلیم! صحیح معاشرے کے نہ بننے کا۔ غلط معاشرے میں افراد کے نیک اعمال ثمر بار نہیں ہوا کرتے۔ جس طرح زمین شور میں تخم ریزی کبھی بار آور نہیں ہوتی۔ عمدہ سے عمدہ بیج بھی ضائع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اس معاشرہ کے اندر بھی اگر کوئی فرد کسی وقت معاشرے سے کٹ جائے تو اس کے انفرادی نیک کام، کوئی وزن نہیں رکھتے۔ سورۂ توبہ میں ان تین صحابہ کا حال دیکھو (حضرت کعب بن مالکؓ، مرارہ ابن الربیعؓ اور ہلال بن امیہؓ) جو غزوۂ تبوک میں معاشرہ کی رفاقت سے پیچھے رہ گئے تھے اور رسول اللہؐ نے انھیں خدا کے فیصلے کے انتظار میں معاشرہ سے الگ کر دیا تھا۔ وہ نمازیں بھی پڑھتے تھے اور قرآن کی تلاوت بھی کرتے تھے۔ وہ اپنے طور پر ان تمام احکام کی پابندی کرتے تھے جن کی پابندی مسلمانوں پر واجب تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی حالت، قرآن کے الفاظ میں یہ ہو چکی تھی کہ

ان پر زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تنگ ہو چکی تھی حتیٰ کہ وہ خود اپنے آپ سے تنگ آچکے تھے اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ نظام خداوندی سے کٹ کر دنیا میں کوئی پناہ کی جگہ نہیں مل سکتی بجز نظام خداوندی کے (۹/۱۱۹)

اس واقعہ کے درج کرنے کے بعد فرمایا کہ

یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصّٰدقین (۹/۱۱۹)

اے ایمان والو! قانون خداوندی سے ہم آہنگ رہو۔ اسی میں اپنی حفاظت تلاش کرو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ رہو جو نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔

میں نے یہاں "صادقین" کا ترجمہ کیا ہے "وہ لوگ جو نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کیلئے سرگرم عمل رہتے ہیں" اسلئے کہ قرآن نے دوسری جگہ صادقین کا مفہوم خود واضح کر دیا ہے جب فرمایا کہ

یقین مانو کہ مومن صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں اور ان کے ایمان میں کوئی چیز تزلزل پیدا نہیں کرتی اور اپنے مال اور جان سے نظامِ خداوندی کے قیام و بقا (فی سبیل اللہ) کیلئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اولٰئک ھم الصّٰدقون۔ یہ لوگ صادقین ہیں۔ (۴۹/۱۵)

لہٰذا قرآنی معاشرے سے الگ ہٹ کر نیک اعمال کوئی وزن ہی نہیں رکھتے اور جب اس معاشرے سے الگ رہ کر نیک اعمال کوئی وزن نہیں رکھتے تو یہ واضح ہے کہ جب یہ معاشرہ سرے سے موجود ہی نہ ہو تو اس میں افراد کے "نیک اعمال" کیا نتیجہ خیز ہوں گے؟ — ایسی حالت میں، اس معاشرہ کے قیام کیلئے جدوجہد ہی وہ اعمالِ صالحہ بن سکتے ہیں جن کا میزانِ خداوندی میں کوئی وزن ہو سکتا ہے[1]۔ یعنی ایسے نظام کے قیام کیلئے جدوجہد جو قرآنی قوانین کے نفاذ کا ضامن ہو اور جس میں خدا کی صفات جگمگ جگمگ کرتی وجہ شادابیٔ قلب و نظر ہوں۔

---

[1] ان کوششوں کی بنیاد ہوتی ہے اس ایمان پر کہ انسانی ذات (Human Personality) کی تربیت و استحکام کی صورت صرف یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کے ماحصل کو نوعِ انسانی کی ربوبیت کیلئے عام (کھلا) رکھے۔ اس باب میں انسان جسقدر کوشش کرتا جائیگا اس کی ذات کا استحکام ہوتا جائے گا۔ اور استحکامِ ذات ہی حیاتِ جاودانی کا دوسرا نام ہے۔ اس معاشرہ کے قیام میں انفرادی کوششیں آغاز کار کا کام دیتی ہیں۔ لیکن خدا کا قانون اسی صورت میں نتیجہ خیز ہوتا ہے اور اس کی صفات اسی وقت مشہود ہوتی ہیں جب اس معاشرے کا عملی قیام ہو جائے۔ اسی کا نام "تمکنِ دین" ہے جس کا ذکر (۲۴/۵۵) میں کیا گیا ہے اور جسے ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ بتایا گیا ہے۔

اگر بہ اِیں نہ رسیدی تمام بولہبی

لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے سلیم! کہ اگر انسانوں کی کوئی ایسی جماعت از خود نہیں اٹھتی جو ظلم و عدوان کی تخریبی قوتوں کی روک تھام کر سکے، تو یہ قوتیں بڑھتی ہی چلی جائیں گی اور خدا کا قانون منہ تکتا رہ جائے گا۔ گذشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جو انسان یہ چاہیں کہ ان کے اعمالِ حیات قانونِ خداوندی کے مطابق نتیجہ خیز ہو جائیں اور وہ ان کے ثمرات و برکات سے فیض یاب ہوں تو اس کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ اس قسم کا معاشرہ متشکل کیا جائے جس میں قانونِ خداوندی ایک جیتے جاگتے نظام کی صورت اختیار کر لے۔ پھر یہ تمام افکار و اعمال اپنے نتائج کو فوراً سامنے لے آئیں گے لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو پھر خدا کا قانون اس نہج سے نتائج مرتب کرتا رہتا ہے جس نہج سے یہ خارجی کائنات میں کارفرما ہے۔ یہ وہ نہج ہے جس کے متعلق قرآن نے بتایا ہے کہ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار برس اور بعض اوقات پچاس پچاس ہزار برس کے برابر ہوتا ہے۔ یعنی ان اعمال کے نتائج آہستہ آہستہ بتدریج مرتب ہوتے اور قرنہا قرن کے بعد ظہور میں آتے ہیں۔ مثلاً خدا کا یہ قانون کہ جو قوم انسانیت کے حقوق میں کمی کرتی ہے وہ تباہ ہو کر رہتی ہے۔ (انہ لا یفلح الظالمون) بہر حال و بہر کیف اپنے نتائج مرتب کر کے رہتا ہے۔ اگر انسانوں کی کوئی جماعت ایسی تیار ہو جائے جو اس قانون کو عملاً نافذ کر دے تو اس صورت میں "قوم الظالمین" اپنے ظلم و فساد کے نتائج (یعنی اپنی تباہیوں اور بربادیوں کو) فوراً اپنے سامنے دیکھ لیتی ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسی جماعت کھڑی نہ ہو تو اس قوم الظالمین کا نظام بتدریج رفتہ رفتہ انہیں تباہیوں کی طرف کھینچکر لیجاتا ہے لیکن اس صورت میں ظہورِ نتائج کیلئے صدیوں کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اس تباہی کی ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ یہ تخریبی قوتیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں اور اس طرح یہ فاسد نظام اپنے ہاتھوں آپ منہدم ہو جاتا ہے۔ "وکذالک نولی بعض الظالمین بعضاً (۶/۱۲۹)" "اس طرح ہم ان ظالمین کی کارستانیوں کی وجہ سے ان کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر مسلط کر دیتے ہیں"۔ اور یا ایسا ہو جاتا ہے کہ زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر (یعنی قوانینِ خداوندی یا سنت اللہ کے اشاروں کو سمجھ کر) ایک قوم اپنے طور پر قانونِ خداوندی کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے زندگی کا مسلک (اپنی مملکت کی پالیسی) بنا لیتی ہے اور اس طرح مخالف قوم کی تباہی آجاتی ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس "تدبیرِ الٰہی" کا نام "استبدالِ قومی" ہے۔ یعنی ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کا متمکن ہو جانا۔

لیکن پہلی صورت ہو یا دوسری، یہ انقلاب (اس دوسری شکل میں بھی) انسانوں ہی کے ہاتھوں سے رونما ہوتا ہے۔ اسلئے یہ حقیقت یہاں بھی اپنی جگہ پر باقی رہتی ہے کہ انسانی دنیا میں خدا کا قانون اپنے نتائج انسانوں ہی کے ہاتھوں سے ظہور میں لاتا ہے۔

اس خط میں ان امور کا تذکرہ محض سرسری طور پر ہو سکا ہے (اسلئے کہ خط میں ایسی لمبی چوڑی تفاصیل کی گنجائش کہاں ہوتی ہے) ان امور کی تفصیل تمہیں "نظامِ ربوبیت" میں ملے گی جسے میں ابھی ابھی ختم کر پایا ہوں۔ اس میں تمہیں نظر آئیگا کہ خدا کے قوانین کس طرح کائناتی انداز سے آہستہ آہستہ اپنے نتائج مرتب کئے جا رہے ہیں اور کس طرح انسانیت کا قدم بتدریج اس منزل کی طرف اٹھتا جا رہا ہے جسے قرآن نے اس کرۂ ارضی پر انسانوں کا آخری معاشرہ قرار دیا ہے۔ وہ معاشرہ جس میں زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

نزولِ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی حدیثیں اور ان کی تنقید

(علامہ تمنا عمادی)

(۲)

کسی حدیث کے صحیح و غلط ہونے کا اگر کوئی صحیح معیار ہو سکتا ہے تو وہ ایک ہی معیار ہے یعنی اگر وہ حدیث عقائد و عبادات اور تعلیم اصول اخلاق و معاملات سے متعلق ہے تو اس کا نص قرآنی کے مطابق ہونا ضروری ہے اور اگر محض دنیاوی کسی ایسی بات سے متعلق ہو جس کا لگاؤ دینی امور سے نہیں۔ تو اگر وہ عقلِ قرآنی و درایت قرآنیہ کے مطابق ہے جبھی اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح تسلیم کی جا سکتی ہے۔

لیکن یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ جو حدیث نص قرآنی کے بالکل مطابق ہو اور عقل و درایت قرآنیہ کے بھی خلاف نہ ہو وہ صحیح ہی ہو۔ چنانچہ ائمہ حدیث کی کتب موضوعات میں ایسی بہت سی حدیثیں ملیں گی جو نہ قرآن کے خلاف ہیں، نہ قرآنی عقل و درایت کے خلاف مگر محدثین نے ان کو دوسرے اسباب کی بنا پر موضوع قرار دیا ہے۔ ان میں اکثر وہی حدیثیں ہیں جن کے راوی مجروح ہیں یا مجہول۔

اس کو بھی خود محدثین نے تسلیم کر لیا ہے کہ کسی حدیث کا صحیح الاسناد ہونا اس کی صحت ثابت کرنے کیلئے کوئی قطعی دلیل نہیں۔ کیونکہ جھوٹی حدیثیں بنانے والے جھوٹے اسناد بھی بنا سکتے تھے اور بناتے تھے۔ من گھڑت حدیثیں عالی اسناد کے ساتھ محدثین کی کتابوں میں داخل کر دیا کرتے تھے۔ اکابر محدثین کے شاگرد بن کر ان کے ساتھ رہ کر ان کے مسودات میں ردوبدل اور کمی و بیشی کے علاوہ مستقل حدیثیں بھی بڑھا دیا کرتے تھے، اس سے کوئی ایسا شخص جس نے فنِ حدیث سے کسی حد تک بھی واقفیت حاصل کی ہو، انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح صرف اس لئے کہ کسی حدیث کے بعض راوی مجروح یا وضاع و کذاب ہیں۔ اگر وہ قرآنی درایت کے مطابق ہے تو اس کو قطعی طور سے موضوع و غلط نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ کوئی جھوٹے سے جھوٹا شخص ہر بات جھوٹی ہی نہیں بولتا کبھی وہ کوئی سچی بات بھی ضرور بولتا ہے۔

اس تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی حدیث بھی جو موجودہ کتب احادیث میں ہے، چاہے وہ صحاح ستہ ہی نہیں بلکہ ساری کتب احادیث کی متفق علیہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس وقت تک صحیح نہیں کہی جا سکتی جب تک درایتِ قرآنیہ اس کی صحت پر مہر تصدیق ثبت نہ کر دے۔ مگر پھر بھی اس کی قطعیت آیاتِ قرآنیہ کی قطعیت کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ کیونکہ ایسی مطابق قرآن صحیح حدیثوں میں جو قطعیت آئی ہے وہ بھی درحقیقت ظنی ہی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مطابق قرآن و درایت حدیثیں

بھی موضوع ہو سکتی ہیں اور محدثین کے نزدیک ایسی کچھ حدیثیں موضوع سمجھی جاتی ہیں۔ البتہ تمام کتب حدیث کا یا صحاح ستہ کا بالاتفاق کسی مطابق قرآن و درایت حدیث کا روایت کرنا اس بات کا ظن غالب پیدا کرتا ہے کہ یہ حدیث واقعی حدیث رسولؐ ہو اور اس میں جو کسی قدر قطعیت کی جھلک آئے گی تو وہ قرآن مبین کے آفتاب قطعیت کا انعکاس ہی سمجھی جائے گی۔

عجمی منافقین و ملاحدہ کی گہری سازش کا ذکر بار بار آچکا ہے۔ رسالہ طلوع اسلام ماہ دسمبر ۵۲ء میں میرا مضمون حدیث مثلہ معہ کی تنقید پر چھپ چکا ہے، اس میں "منافقین کے مراکز" کے عنوان کے ماتحت صفحہ ۵۴ میں، میں نے ان شہروں کی نشاندہی کی ہے جہاں جہاں ان مفسدین نے اپنے مراکز بنائے تھے، ان میں خراسان سب سے پہلا مرکز اور سب سے بڑا تھا اور وہ برابر ہر فتنے کا مرکز رہا پھر کوفہ و بصرہ اور شام و عراق کے اکثر شہر چھوٹے بڑے مرکز بنتے گئے۔ جن میں کچھ مستقل ٹکسال جہاں حدیثوں کے گھڑنے کے بڑے بڑے کارخانے تھے اور بعض مقامات اشاعت گاہیں تھیں۔ اس لئے جس موضوع پر بہت سی حدیثیں ملیں اور کثرت طرق پیدا کر کے بزعم خود ان کو متواتر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اگر وہ مخالف قرآن و خلاف درایت قرآنیہ حدیث ہے تو یقیناً اس کے راویوں میں عجمیوں، خراسانیوں، کوفیوں، بصریوں، شامیوں، عراقیوں اور مصریوں کی آپ کثرت پائیں گے اور اس حدیث کے تمام طرق کے راویوں کا سلسلہ ملا کر دیکھیں گے تو یہ بات صاف معلوم ہو جائیگی کہ منافقین عجم کے مراکز کی یہ متفقہ سازش کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ نزول عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے متعلق بھی جو حدیثیں ان منافقین عجم نے گھڑیں ان کے طرق روایت اور راویوں کے سلسلوں پر نگاہ ڈالئے تو حقیقت کھل جائے گی۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ منافقین عجم نے سلسلہ روایت کو آخر تک پہنچانے کیلئے کن کن صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام استعمال کئے ہیں؟ اگر وہ من گھڑت حدیثیں خلافت بنی عباس کے زمانے میں گھڑی گئی ہیں تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا نام ضرور ہوگا اور اگر خلافت بنی امیہ کے زمانے میں وہ حدیثیں گھڑی گئی ہیں تو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کا نام ضرور آئے گا۔ اور پھر کثرت طرق ثابت کرنے کے لئے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے نام کو تو عموماً یہ مفسدین ہر زمانے میں استعمال کرتے رہے ان کے علاوہ بعض اصاغر صحابہ خصوصاً وہ جو کوفہ یا بصرہ یا شام کے علاقوں میں آبسے تھے ان لوگوں کے نام خوب خوب استعمال کئے گئے۔ بلکہ کتنے صحابہ بھی گھڑے گئے یعنی درحقیقت ان ناموں کی کوئی شخصیت صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت میں تھی ہی نہیں۔ مگر ایک نام گھڑ کر ان کو صحابی قرار دیکر ان کی طرف سلسلہ روایت کو کھینچکر پہنچا دیا گیا۔ اس قسم کی دلیری کوفہ وغیرہ کے بعض متقدمین نے کی ہے۔ چنانچہ نزول عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے متعلق بھی جو حدیثیں گھڑی گئیں تو حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت جابر بن عبداللہ، ابوسریحہ حذیفہ بن اسید اور نواس بن سمعان کی طرف منسوب کی گئیں۔

حضرت ابوہریرہ غزوہ خیبر سے کچھ پہلے ۶ھ میں مشرف باسلام ہوئے تھے اور صرف پانچ برس یا دو ایک ماہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے مستفیض ہوئے۔ مگر جو لوگ تیئس ۲۳ سال تک برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور ساعۃ العسرۃ سے لیکر عہد حکومت و امارت تک، یہانتک کہ وفات نبوی تک ساتھ رہے ان سب سے زیادہ حدیثیں انھیں کو

یاد تھیں۔ دفع دخل کے طور پر یہ حدیث گڑھ لی گئی کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مجلس میں فرمایا کہ کون ہے جو اپنی چادر اتنی دیر تک پھیلائے رکھے جب تک میں بولتا رہوں تاکہ جو کچھ مجھ سے سنے وہ اس کو کبھی نہ بھولے تو ابوہریرہ نے اپنی چادر پھیلا دی۔ جب آپ باتیں تمام کر چکے تو انھوں نے اپنی چادر سمیٹ لی تو آپ جو کچھ بولے تھے وہ لفظ بلفظ ان کو یاد تھا۔ تعجب ہے کہ جب آپ نے اپنی مجلس میں اور لوگوں کے سامنے ایسا فرمایا تھا تو صرف ابوہریرہ ہی نے اپنی چادر کیوں پھیلائی صحابہ میں سے کون نہیں چاہتا ہوگا کہ آپ سے جو کچھ سنیں وہ سب یاد رہے۔ اس روایت کی کمزوری نہایت واضح تھی۔ تو یہ واقعہ گھڑا گیا کہ ایک بار زید بن ثابت اور ابوہریرہ اور ایک صحابی اور مسجد میں اللہ کو یاد کر رہے تھے اور کچھ دعائیں ہر شخص اپنے لئے کر رہا تھا اتنے میں رسول اللہ صلعم وہاں پہنچ گئے تو یہ لوگ چپ ہو رہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ جو دعا کر رہے تھے اس کا اعادہ کرو۔ تو زید نے اور ان کے ساتھی نے یکے بعد دیگرے دعا کی اور آپ نے دونوں کی دعاؤں پر آمین کہی۔ اس کے بعد ابوہریرہؓ نے کہا کہ یا اللہ جو کچھ ان دونوں نے مانگا ہے میں وہ بھی مانگتا ہوں اور تجھ سے ایسا علم مانگتا ہوں جس کو نہ بھولوں۔ آپ نے آمین کہی۔ تو ان دونوں نے بھی کہا کہ اے اللہ میں ایسا علم مانگتا ہوں جس کو نہ بھولوں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس کے لئے تو تم سے پہلے یہ دوسی غلام سبقت کر چکا۔ یہ روایت بھی اپنے موضوع ہونے کا صاف پتہ بتا رہی ہے کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ کی عمر ان کے مشرف باسلام ہونے کے وقت ۲۷ یا ۲۸۔ یا ۲۹ برس کی تھی حسب اختلاف سال وفات۔ اور یہ واقعہ اگر کہا جائے گا تو اسلام لانے کے دو ایک برس بعد ہی کا کہا جائے گا جس وقت ان کی عمر کم سے کم تیس برس کی تسلیم کی جائے گی۔ اور تیس برس کے مرد کو عربی محاورے کے رو سے غلام کا لفظ نہیں کہا جا سکتا۔ غلام کے معنی لڑکے، چھوکرے کے ہیں جو عموماً نابالغ لڑکوں کو کہا جاتا ہے۔ یا نوبالغ کو کہہ سکتے ہیں جو بے ڈاڑھی مونچھ کا ہو۔ تیس برس کے جوان کو کبھی غلام نہیں کہیں گے اگر کہیں گے تو فحش کہیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو افصح العرب والعجم تھے ایک تیس برس کے جوان کو غلام نہیں فرما سکتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ اس حدیث کے گھڑنے والے کو حضرت ابوہریرہؓ کی عمر معلوم نہ تھی وہ سمجھا کہ حضرت زید بن ثابتؓ کے ہم عمر ہوں گے جو ہجرت کے وقت دس گیارہ برس کے تھے اور ابوہریرہؓ تو زید بن ثابتؓ کے بھی بہت بعد یعنی پانچ چھ برس بعد ایمان لائے تھے تیسرے صاحب کا نام ہی نہیں بتایا تاکہ قرینے سے حضرت انس وغیرہ سمجھے جا سکیں۔ واقعے کا انداز بیان بھی یہی بتا رہا ہے کہ یہ تینوں ہم سن کم عمر قریب البلوغ یا نوجوان لڑکے تھے۔ اس حدیث کے گھڑنے والے نے حضرت ابوہریرہ کے لئے غلام کا لفظ استعمال کیا اور اس کا بہتان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر باندھا۔

ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۲۶۶ باب الکنیٰ میں لکھتے ہیں کہ ابوہریرہؓ (۷۸) برس کی عمر میں ۵۷ھ یا ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں راہی جنت ہوئے اور غزوۂ خیبر کے سال یعنی ۷ھ میں مشرف باسلام ہوئے تھے اسلام قبول کرنے کے وقت ان کی عمر کا اسی سے حساب کر لیجئے۔ زید بن ثابتؓ سے ابوہریرہؓ کم سے کم دس برس ضرور بڑے تھے۔ غرض یہ دونوں حدیثیں اسی لئے گھڑی گئی ہیں تاکہ ابوہریرہؓ سے جو حد سے زیادہ حدیثیں مروی ہیں اور ان کی کثرت جو خلاف عقل معلوم ہوتی ہے اس کو کسی طرح روایت پرستوں کے

تردیک مطابق عقل بنایا جائے۔

نزول مسیح کے متعلق حضرت ابوہریرہؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے بھی ایک حدیث ہے جو فقط صحیح مسلم میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح جابر بن عبداللہ سے ایک حدیث منسوب کی گئی ہے وہ بھی صرف صحیح مسلم میں ہے۔ اور پھر ابوسریحہ حذیفہ بن اسید سے بھی بواسطہ ابوالطفیل کچھ حدیثیں ہیں جن میں سے صرف ایک حدیث ایک تحویل کے ساتھ ابوداؤد میں ہے اور باقی دو حدیثیں بچند تحویلات مسلم میں۔ اور نواس بن سمعان سے کچھ حدیثیں بچند تحویلات دو طرق ہیں جن کو صرف جُبَیر بن نُفَیر ان سے روایت کرتے ہیں اور جُبیر سے صرف ان کے بیٹے عبدالرحمٰن روایت کرتے ہیں اور ان سے صرف عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر بلا واسطہ صرف ابن ماجہ میں اور مسلم و ابوداؤد و ترمذی میں بواسطہ یحییٰ بن جابر الطائی روایت کرتے ہیں۔

اور ایک حدیث اور بھی صرف ابن ماجہ میں ہے جو ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نہیں بلکہ ابوسعید کھڈری[1] سے مروی اور اس سے عطیہ العوفی روایت کرتا ہے۔ بخاری کی دو حدیثوں کے سوا بس یہی فہرست ہے صحاح کی ان حدیثوں کی، جو نزول عیسیٰؑ کے متعلق گھڑی گئی ہیں، طوالت کے ڈر سے میں نے درمیان کے بہت سے لطائف چھوڑ دیئے خصوصاً حضرت ابوہریرہؓ و حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے متعلق۔

حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، اور حضرت جابر بن عبداللہ تو مشہور صحابہ میں سے ہیں اسلئے تاریخ اسلام سے باخبر حضرات کم سے کم ان بزرگوں کے ناموں سے ضرور واقف ہیں مگر ابوسریحہ حذیفہ بن اسید اور نواس بن سمعان کے ناموں سے بہت سے علما بھی جو صرف کتب حدیث کے اول و آخر استاد کے سامنے پڑھ کر سند حدیث لے لیا کرتے ہیں نہیں جانتے ہوں گے۔ اسی طرح حضرت ابوالطفیل سے بھی کم ہی لوگ آشنا ہوں گے لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے سب سے آخر میں وفات پانے والے یہی ہیں اس لئے ان کے نام سے نہیں تو ان کی کنیت سے بہت لوگ واقف ہو سکتے ہیں۔ ان کا نام عامر بن واثلہ الکنانی ہے۔ بعضوں نے عمرو بن واثلہ بھی لکھا ہے مگر عامر ہی صحیح ہے۔ یہ جنگ احد کے سال پیدا ہوئے تھے یعنی ۳ھ میں۔ وفات نبویؐ کے وقت پورے آٹھ برس کے بھی نہ ہوں گے۔ اس لئے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف دیکھا تھا کمسنی کی وجہ سے فیض صحبت سے متمتع ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے اور کوفے میں اقامت کر لی تھی حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد کوفے سے نکلے چلے آئے اور یہیں ۸۵ھ میں وفات پائی۔ شیعوں کی روایت کے مطابق یہ کوفے ہی میں رہے اور کوفے ہی میں وفات پائی۔ بہرحال کوفیوں نے ان کی طرف اپنی من گھڑت حدیثیں بہت منسوب کیں۔ جن میں سے ایک یہ حدیث بھی ہے چونکہ وفات نبوی کے وقت یہ بہت کمسن تھے اس لئے ان سے اکثر حدیثیں بواسطہ کسی دوسرے صحابی کے بنائی گئیں چنانچہ آپ یہاں بھی ان کی روایت ابوسریحہ حذیفہ بن اسید سے دیکھ رہے ہیں۔

حذیفہ بن اسید جن کی کنیت ابوسریحہ ہے۔ ان کا شمار بھی کوفیوں ہی میں ہے کوفہ چلے آئے تھے اور یہیں وفات پائی ۴۲ھ میں۔

---

[1] یہ ابوسعید کھڈری کون ہیں اس کا ذکر ان کی حدیث کی تنقید میں آئیگا۔ ۱۲ منہ

صفی الدین خزرجی خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال میں لکھتے ہیں کہ ان سے صرف چار حدیثیں مروی ہیں اور ابو الطفیل اور شعبہ ان سے روایت کرتے ہیں۔ ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ ان سے ابو الطفیل اور شعبہ کے علاوہ معبد بن خالد اور ہلال بن ابی حصین بھی روایت کرتے ہیں۔ مگر مسند احمد بن حنبل جو جامع حدیث رطب و یابس ہے اس کی جلد چہارم میں ان سے سات حدیثیں مروی ہیں اور سب ابو الطفیل ہی کی روایت سے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابو الطفیل کے سوا ان سے اور کوئی روایت نہیں کرتا۔

بہرحال حدیث کی تدوین کا کام تو سنانہ کے بعد سب سے پہلے ابن شہاب زہری نے شروع کیا تھا جو وقت نہ ابوسریحہ حذیفہ بن اسید تھے نہ غریب ابو الطفیل زندہ تھے۔ اس لئے ان بزرگوں کے بعد ان کے ناموں کو کوفہ و بصرہ و مصر و دمشق اور خراسان و مرو وغیرہ کے وضاعین و کذابین جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ اس میں ان بے گناہوں کا کیا قصور۔

تو اب دیکھئے، حضرت ابوہریرہؓ سے بخاری کی دو روایتیں (جن کی تنقید آپ دیکھ چکے) اور مسلم کی آٹھ حدیثیں سات تحویلوں کے ساتھ صرف ابن شہاب زہری سے ہیں جن کو وہ سعید بن المسیب اور نافع مولیٰ ابی قتادہ انصاری سے روایت کرتے ہیں۔ ان دونوں کا ذکر بخاری کی دونوں حدیثوں کی تنقید میں آچکا ہے۔ مگر ان دونوں کی روایتوں کے تنہا ذمہ دار ابن شہاب زہری ہیں۔ اور ان دسوں حدیثوں کے تنہا راوی بروایت سعید و نافع وہی ہیں۔ سعید و نافع کے دوسرے تلامذہ میں سے جن کی تعداد غالباً پچاس سے کم نہ ہوگی، کسی کو بھی ان دس حدیثوں میں سے کسی ایک حدیث کی بھی خبر نہ تھی۔ اور آپ ابن شہاب زہری سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں۔ اسلئے ان دس حدیثوں کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں جو حضرت ابوہریرہؓ کے سر تھوپی گئی ہیں۔

ابن شہاب زہری سے روایت کرنے والوں کو بھی اگر آپ دیکھیں تو عقیل و یونس جو زہری کے ہموطن اور خاص شاگردوں میں سے تھے ان دونوں سے آپ بخاری کی دونوں حدیثوں کی تنقید میں واقف ہو چکے ہیں صالح کا حال بھی اس میں بیان ہو چکا ہے کہ یہ صالح بن کیسان المروزی النیسا پوری نہیں ہیں بلکہ صالح بن محمد بن ابی زائدہ المدنی ہیں جو بالاتفاق غیر ثقہ ضعیف فی الحدیث اور منکر الحدیث تھے ابن شہاب زہری کے بھتیجے محمد بن عبداللہ بن مسلم کو عثمان الدارمی، ابن معین، یحیی بن سعید، ابن ابی خیثمہ عقیلی، ابوحاتم وغیرہ تقریباً ائمہ رجال کی ایک بڑی جماعت ضعیف الحدیث منکر الحدیث، غیر ثقہ اور لایحتج بہ کہتے ہیں۔

لیث بن سعد المصری جو قریش کے آزاد کردہ غلام تھے بہت سخت مُدَلِّس تھے۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ ان کے استاد یحییٰ بن سعید القطان لیث سے سخت بدظن تھے اس حد تک کہ ان کی بدظنی دور نہیں کی جاسکی۔ (لسان المیزان ج۲ ص۱۳ ترجمہ حجاج بن ارطاۃ) اور محمد بن عبدالرحمٰن بن مغیرہ بن الحارث بن ابی ذیب یوں تو بڑے ثقہ و معتبر سارے محدثین کے نزدیک ہیں۔ مگر زہری ہی کی حدیثوں میں بعض اکابر محدثین وائمہ رجال ان کو معتبر نہیں سمجھتے چنانچہ تہذیب التہذیب ج۹ ص۳۰۵ میں ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ غیر ان روایتہ عن الزہری خاصۃ تکلم فیہا بعضہم بالاضطراب۔ یعنی مگر یہ کہ خصوصیت کے ساتھ زہری سے ان کی روایتوں میں بعض محدثین وائمہ رجال نے کلام کیا ہے ان حدیثوں کے معنوی اضطراب کے متعلق۔ پھر آخر ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ کان یحییٰ بن سعید لا یرضی حدیث ابن ابی ذیب وابن جریج عن الزہری ولا یقبلہ یعنی یحییٰ بن سعید ابن ابی ذیب اور ابن ابی جریج کی حدیثیں

جنھیں یہ دونوں زہری سے روایت کرتے تھے ان کو پسند نہیں کرتے تھے اور یہ حدیث زہری ہی سے روایت کر رہے ہیں اسلئے اب آپ خود اس حدیث کی نوعیت کو سمجھ لیجئے اور پھر ابن ابی ذیب سے اس حدیث کو جو روایت کرتے ہیں وہ ولید بن مسلم دمشقی ہیں جو بنی امیہ یا بنی عباس کے غلام آزاد کردہ تھے اور ابو السفر جو ایک مشہور کذاب اور مفتری تھا اس سے حدیثیں لے لیکر دوسرے ثقہ راویوں کی طرف منسوب کر کے روایت کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ حدیث بھی ابو السفر ہی سے لیکر غریب ابن ابی ذیب کے سر دھوپ دی ہو۔

اب ابن شہاب سے روایت کرنے والوں میں صرف ابن عیینہ رہ گئے۔ یہ سفیان بن عیینہ کوفی تھے۔ سنیوں میں سنی اور شیعوں میں شیعہ رہے۔ شیعوں کی کتب رجال میں ان کا ذکر خیر موجود ہے۔ ان سے تین شخص اس حدیث کو روایت کرتے ہیں۔ عبد الاعلیٰ بن حماد الباہلی جو نہ باہلی نہ تھے بلکہ خراسانی تھے اور قبیلہ بنی باہلہ کے کسی شخص کے غلام آزاد کردہ تھے۔ بصرہ میں بس گئے تھے ان کا خراسانی ہونا، غلام آزاد کردہ ہونا اور پھر بصری ہونا خود ان کے مشتبہ ہونے کے لئے کافی ہے۔ دوسرے زہیر بن حرب ہیں یہ بھی خراسانی تھے اور قبیلہ بنی حریش میں سے کسی کے غلام آزاد کردہ تھے۔ یہ نسائی مشہور ہیں۔ "نسا" خراسان ہی کا ایک شہر تھا جہاں کے امام نسائی صاحب السنن مشہور ہیں۔ اور خراسانی ہونے کی وجہ سے وہ بھی مائل بہ تشیع تھے۔ جس کو اہل علم محدثین خوب جانتے ہیں اور کتابوں میں لکھ دیا ہے۔ غرض عبد الاعلیٰ اور زہیر دونوں خراسانی، دونوں غلام آزاد کردہ اور دونوں بصری تھے، زہیر بعد کو بغداد میں آ رہے تھے۔ اس لئے دونوں کی باہمی سازش صاف نمایاں ہے کہ ایک حدیث ابن عیینہ کی طرف منسوب کر کے دونوں روایت کریں۔ تیسرے صاحب ان دونوں کے ساتھی ابو بکر بن شیبہ ہیں جن کا پورا نام عبد الرحمٰن بن عبد الملک بن شیبہ ہے یہ بھی قبیلہ خزام کے غلام آزاد کردہ تھے جن کو امام ابو داؤد صاحب السنن نے اور حافظ ابو احمد الحاکم نے ضعیف الحدیث قرار دیا ہے۔ انھیں تینوں سے امام مسلم کو یہ زہری والی حدیث ابن عیینہ کے واسطہ سے پہنچی۔ ابن شہاب اور تنہا ابن شہاب سے یہ چھبیس[۲۶] آدمی روایت کرتے ہیں۔ جن میں سے صرف تین[۳] سے ترمذی کو اور نو[۹] سے امام بخاری اور بیس سے امام مسلم کو یہ حدیث ملتی ہے تو اگر اس سے بزعم خود تواتر ثابت کیا جا سکتا ہے تو صرف اس کا تواتر ہوگا کہ ابن شہاب نے یہ حدیث روایت کی ہے، نہ یہ کہ اس سے اس کے حدیث رسول ہونے پر تواتر ثابت ہو سکتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس کو کسی حیثیت سے تواتر کہہ بھی نہیں سکتے۔ تواتر کی تعریف میری کتاب اعجاز القرآن میں دیکھئے جو طلوع اسلام میں چھپ رہی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ابن شہاب زہری کے علاوہ تین آدمی اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرنے والے مہیا کئے گئے ہیں تاکہ ابن شہاب ہی تنہا اس کے راوی نہ ٹھہریں مگر ان تینوں کی خبر امام بخاری کو نہ تھی۔ یا صحیح بخاری میں ان تینوں کی حدیثیں ٹھونسنے کا کسی کو موقع نہ ملا۔ نزول عیسیٰؑ کے متعلق حدیثیں ٹھونسنے کا موقع یاران طریقت کو صحیح مسلم میں کافی طور سے مل گیا۔ چنانچہ کتاب العلم اور کتاب الفتن دو جگہ حدیثیں ٹھونسی گئیں۔ بہر حال ابن شہاب کے علاوہ عطا بن مینا جو مرو کے رہنے والے مگر ابن ابی ذباب المالنی کے غلام آزاد کردہ تھے۔

اس لئے ابن حجران کو مدنی لکھتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ بعضوں نے ان کو بصری کہا ہے اور پھر آخر میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ابن سعد نے اپنی کتاب طبقات میں ان کو اہل مکہ طبقۂ ثانیہ میں شمار کیا ہے۔ مگر تھوڑا تدبر کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی شخص ہی نہ تھے، اپنے جی سے ایک نام گھڑ کر اس سے روایت کی گئی، کیونکہ ان کا ذکر کسی کتاب میں بھی تفصیل سے نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ ان کا سالِ وفات بھی کہیں مذکور نہیں۔ ان کے وطن کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہو گیا کہ مدنی بھی تھے اور مکی بھی اور پھر بصری بھی تھے۔ ان کے دادا پردادا کی بھی کچھ خبر نہیں۔ اور حضرت ابوہریرہؓ کے سوا اور کسی سے یہ کوئی روایت بھی نہیں کرتے۔ اسی لئے رجال والوں نے لکھ دیا کہ ابوہریرہؓ کے خاص لوگوں میں تھے۔ یعنی ایسے ہی خاص لوگوں میں سے تھے جنھوں نے کبھی کسی دوسرے صحابی سے کوئی حدیث سنی ہی نہیں اور نہ سننے کی خواہش کی۔ حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ یہ کس عمر میں تھے یہ بھی نہیں معلوم۔ ابن ابی ذباب کے غلام آزاد کردہ تھے۔ ابن ابی ذباب کی وفات ۱۴۶ھ میں ہے۔ انھوں نے ان کو کس سنہ میں آزاد کیا؟ اس وقت ان کی عمر کیا تھی؟ حضرت ابوہریرہؓ کی وفات ۵۸ھ میں ہوئی۔ اور وہ وفات سے کئی سال پہلے مقام عقیق میں جا بسے تھے اور وہیں انھوں نے وفات پائی۔ ابن ابی ذباب نے کوئی بڑی عمر نہیں پائی حضرت ابوہریرہ اور ابن ابی ذباب دونوں کی وفات کے درمیان تقریباً نوے برس کا فاصلہ ہے۔ اسلئے ابن ابی ذباب ہی نے حضرت ابوہریرہ کو نہیں دیکھا ہوگا ان کے آزاد کردہ غلام نے کب دیکھا ہوگا اور وہ جو عبداللہ یا عبیداللہ (یا دونوں) ابن عبدالرحمٰن بن الحارث بن سعد بن ابی ذباب ہیں جن کو دوسی المدنی ابن حجر نے لکھا ہے ان کی کوئی شخصیت ہی نہیں ہے لکھتے ہیں کہ وہ اپنے باپ سے اور ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں حالانکہ ان کے باپ عبدالرحمن بن الحارث بن سعد بن ابی ذباب الدوسی المدنی کا کہیں کوئی ذکر ہی نہیں کرتا۔ وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرنے والے ایک فرضی راوی ہیں۔ اسی وجہ سے عبداللہ کا سال وفات بھی کہیں مذکور نہیں۔

غرض حالات کا جائزہ لینے سے اس کا کوئی قرینہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ عطاء بن مینا صاحب اگر واقعی کوئی شخص ہوں بھی تو وہ حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہوں۔ اگر وہ حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے تو یقیناً دوسرے صحابہ بلکہ بعض ام المومنین رضی اللہ عنہم سے بھی ضرور روایت کرتے۔ اور پھر یہ عطاء بن مینا صاحب والی حدیث صرف امام مسلم ہی کو ملی اور کسی کو بھی نہ ملی۔ حالانکہ قتیبہ بن سعید جن سے امام مسلم اس حدیث کو روایت کر رہے ہیں۔ ان سے امام بخاری وغیرہ بہتیرے ائمہ حدیث حدیثیں روایت کرتے ہیں اور نہ اس حدیث کے سلسلۂ اسناد میں کوئی ایسا شخص ہے کہ جس کی حدیث امام بخاری وغیرہ نے نہ لی ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ حدیث بخاری و ترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ وغیرہ کسی کتاب میں نہیں ہے اس لئے یقیناً یہ حدیث بھی مسلم میں الحاقی ہے۔

دوسرے صاحب ابوصالح ذکوان ہیں جو حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ یہ جویریہ بنت احمس الغطفانی کے غلام آزاد کردہ تھے۔ مدنی تھے مگر تیل کا کاروبار کرتے تھے اور کوفہ میں ان کا کاروبار تجارت رہتا تھا۔ مدینے سے برابر کوفے آتے تھے اور بنی اسد جن میں شیعوں کی اکثریت تھی انھیں کے محلے میں ٹھہرتے تھے اور یہ محلہ وضاعین و

کذابین کا خاص اڈا تھا۔ کوفے کے محدث اعظم سلیمان بن مہران الاسدی جن کا لقب اعمش ہے اور صحاح وغیر صحاح کے دفاتر جن کی حدیثوں سے بھرے پڑے ہیں اور جن کے متعلق بڑے بڑے ائمہ رجال نے فرمایا کہ افسد حدیث اھل الکوفۃ ابو اسحٰق والاعمش کم ھذا یعنی اہل کوفہ کی حدیثوں کو ابو اسحٰق السبیعی نے اور تمہارے ان اعمش صاحب نے تباہ کر دیا۔ شیعوں کے یہاں بھی یہ بہت ممدوح ہیں، یہ اعمش بھی بنی اسد سے تھے اور اسی محلے کے رہنے والے تھے۔ پھر اعمش صاحب کے خاص استاد موسیٰ بن طریف الاسدی جن سے صرف اعمش ہی روایت کرتے ہیں اور مشہور کذاب تھے یہ بھی بنی اسد ہی سے تھے اور انھیں کے محلے میں رہتے تھے۔ اور اسی زمانے میں رہتے تھے۔ محلہ بنی اسد میں اسدی راویوں کا بہت بڑا اجتماع تھا اور یہ اجتماع تقریباً دو ڈھائی صدی تک رہا۔

ہم ان میں سے چند اسدی راویان حدیث کا ذکر یہاں کر دیتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوگا کہ کوفے کا یہ محلہ اور یہ قبیلۂ بنی اسد روایت احادیث میں کتنا سرگرم تھا اور کیسے کیسے راویانِ احادیث یہاں رہے۔ [1] مسیب بن رافع الاسدی مات ۸۵ھ۔ [2] یحییٰ بن وثاب الاسدی مات ۱۳۳ھ۔ [3] شمر بن عطیہ بن عبدالرحمٰن الاسدی۔ [4] واصل بن حیان الاسدی مات ۱۲۰ھ۔ [5] حبیب بن ابی ثابت الاسدی مات ۱۱۹ھ۔ [6] عاصم بن ابی النجود بہدلۃ الاسدی مات ۱۲۸ھ۔ [7] ابو حصین عثمان بن عاصم بن حصین الاسدی مات ۱۲۸ھ۔ [8] عائذ بن نصیب الکاہلی الاسدی۔ [9] حکیم بن جبیر الاسدی۔ عامر بن شقیق بن حمزۃ الاسدی۔ [11] ربیع بن خثیم الاسدی۔ [12] علاء بن المسیب بن رافع الاسدی۔ [13] ابو محمد حسن بن الحر الاسدی مولیٰ بنی اسد۔ [14] وقار بن ایاس الاسدی۔ [15] عبدالعزیز بن سیاہ الاسدی۔ [16] ابو شہاب الاکبر موسیٰ بن نافع مولیٰ بنی اسد۔ [17] اسمٰعیل بن عبدالملک بن رضیع الاسدی۔ [18] قیس بن رفیع الاسدی۔ [19] قبیصہ بن جابر الاسدی۔ [20] قران بن تمام الاسدی۔ [21] المعرور بن سوید ابو امیہ الاسدی۔ [22] زر بن حبیش الاسدی۔ [23] ابو وائل شقیق بن سلمہ الاسدی۔ [24] محمد بن القاسم الاسدی ـــ [25] محمد بن الاعلیٰ بن کناسۃ الاسدی۔ [26] ابو احمد محمد بن عبداللہ بن الزبیر الاسدی مولیٰ بنی اسد۔ [27] معاویہ بن ہشام القصار الاسدی مولیٰ بنی اسد۔ [28] اسحٰق بن منصور بن حیان الاسدی۔ [29] محمد بن الصلت ابو جعفر الاسدی مولیٰ بنی اسد۔ [30] یحییٰ بن بشر بن کثیر ابو زکریا الاسدی۔ [31] دینار بن عمر الاسدی مولیٰ بشر بن غالب۔

یہ اکتیس راویانِ احادیث کے نام ہم نے محض سرسری طور سے لکھ دیئے ہیں جو سب کے سب اسدی اور کوفی ہیں اور محلہ بنی اسد[1] کے رہنے والے یا ان کے پڑوسی ہیں۔ ان میں کتنے ہیں جن کو خود محدثین وضاع و کذاب یا غیر ثقہ و منکر الحدیث و ضعیف وغیرہ لکھ رہے ہیں۔ اور کتنے ایسے ہیں جو محدثین کے نزدیک تو ثقہ اور نہایت معتبر ہیں مگر ان کی حدیثوں اور ان کے اقوال پر غور کرنے سے ان کی حقیقت صاف روشن ہو جاتی ہے۔ مثلاً زر بن حبیش الاسدی الکوفی سے اختلاف قرأۃ وغیرہ کی حدیثیں بہت مروی ہیں اور قرآن میں کمی بیشی کے متعلق یہ بہت روایتیں کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح یحییٰ بن وثاب وغیرہ بھی ہیں۔ اگر

---

[1] جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب مبہمات القرآن صفحہ ۲۶ میں لکھا ہے کہ سورہ حجرات کے دوسرے رکوع میں جو فرمایا گیا ہے۔ قالت الاعراب اٰمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم۔ یہ آیت بنی اسدی کے متعلق اتری ہے جس کی روایت وہ سعید بن جبیر سے کرتے ہیں۔ واللہ اعلم ۱۲ سنہ غفرلہ

تھوڑا وقت صرف کیا جائے تو بنی اسد کے اور راویاں حدیث جو کوفے میں تھے ان کے نام بھی مل سکتے ہیں۔ اور پھر بصرہ، دمشق مصر وغیرہ میں بھی اس جماعت کے لوگ کافی طور سے پھیلے ہوئے تھے اور پھر بنی اسد کے علاوہ دوسرے قبیلے کے ایسے لوگ بھی کوفے میں کم نہ تھے جن کا کام صرف جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر پھیلانا ہی تھا جن میں سدی کبیر و سدی صغیر اور کلبی وغیرہ تو دنیا بھر میں مشہور ہیں اور ایک بہت بڑا کذاب خبیث راوی قبیلہ بنی اسد ہی کا تھا محمد بن سعید بن حسان بن قیس الاسدی جس کو آخر سولی دی گئی۔ دس ہزار جھوٹی حدیثیں اس نے گھڑیں، شامی تھا۔ کوفیوں اور شامیوں نے اس کا نام بدل بدل کر اس کی حدیثیں روایت کیں، یہ ابن شہاب زہری کا خاص شاگرد تھا۔ زہری اور ان کے بعض ہمعصروں سے روایت کیا کرتا تھا۔ ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۸۴ سے ص ۲۸۶ تک اس کا ترجمہ لکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ تقریباً سو ناموں سے ان کو لوگوں نے نامزد کر کے ان کی من گھڑت حدیثیں روایت کیں طبری نے تاریخ میں ابن سعید کے عوض ابن سعدان کوبنا کر ان سے روایت کی ہے۔

تیسرے صاحب جو حضرت ابوہریرہؓ سے ابن شہاب کے علاوہ روایت کرنے والوں میں سے ہیں وہ عبدالرحمٰن بن آدم ہیں۔ یہ نوزائیدہ ایک جگہ پڑے ہوئے ایک عورت ام برثن کو ملے تھے انھوں نے ان کی پرورش کی اس لئے لوگ ان کو ابن برثن بھی کہتے ہیں مگر زیادہ لوگ مولیٰ ام برثن کہتے ہیں اور حضرت آدم ابوالبشر کی طرف ان کو منسوب کر کے ابن آدم لکھتے ہیں۔ یہ بصری ہیں۔ ان کو ابن معین نے مجہول قرار دیا ہے اور واقعی مجہول الحال ہیں۔ ان کا حال کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ وہ ام برثن جنھوں نے ان کو پالا تھا وہ کون تھیں کس قبیلے کی کس شہر کی تھیں اور کس سنہ میں ان کو پایا تھا کہیں کچھ مذکور نہیں۔ کس سنہ میں انھوں نے وفات پائی یہ بھی مذکور نہیں۔ عبداللہ بن عمر، ابوہریرہ، جابر غالباً ابن عبداللہ سے اور ایک رجل من الصحابۃ سے یہ روایت کرتے ہیں یہ مدینے کب آئے اور کب تک رہے اور کن کن کی صحبت میں رہے کسی بات کا پتا نہیں۔ ان سے قتادہ بصری روایت کرتے ہیں جو ہر کس و ناکس سے روایت کے عادی تھے اور مدلس بھی تھے، دوسرے ابوالعالیہ براء البصری روایت کرتے ہیں جن کی وفات ۹۰ھ میں ہوئی مگر ان کے ترجمے میں اس کا ذکر نہیں کہ یہ عبدالرحمٰن بن آدم سے بھی روایت کرتے ہیں اور ان سے سلیمان بن طرخان البصری بھی روایت کرتے ہیں جو تشیع تھے شیعوں کے یہاں بھی موجود ہیں اور پھر ابوالورد بن ثمامہ بھی ان سے روایت کرتے ہیں جن سے ابومسعود سعید بن ایاس الجریری کے سوا اور کوئی روایت نہیں کرتا اور آخری راوی ان سے عوف الاعرابی ہیں جن کو ابن حجر نے کان قدریاً رافضیاً مشبطاً لکھا ہے اور یہ سب کے سب بصری ہیں۔ غرض یہ خود بصری ہیں اور ان سے روایت کرنے والے بھی بصری اور ان کا حال بالکل مبہم نامعلوم اس لئے ان کی روایت حضرت ابوہریرہ سے کسقدر مشتبہ ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔ غرض یہ حدیث عبدالرحمٰن بن آدم البصری کو ابوہریرہ سے ملی، ان سے قتادہ البصری کو ان سے ہمام بن یحییٰ البصری کو ان سے ہدبہ بن خالد البصری کو ملی اور جب ابوداؤد السجستانی ۲۲۰ھ میں بصرہ پہنچے تو انھوں نے ہدبہ بن خالد سے سُن لی۔ یہ حُسن اتفاق امام ابوداؤدی کو قسمت سے لکھا ہوا تھا ورنہ ان کے سوا نہ ہدبہ نے کسی سے کہا، نہ ہدبہ کے سوا ہمام بن یحییٰ نے کسی سے کہا۔ نہ ہمام کے سوا قتادہ نے کسی سے کہا، نہ قتادہ کے سوا عبدالرحمٰن بن آدم نے اس حدیث کو کسی اور سے بیان کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابن شہاب والی روایت تو بخاری، مسلم،

ابوداؤد اور ترمذی سب کو کسی نہ کسی شکل کسی نہ کسی عبارت اور کسی نہ کسی عنوان بیان سے مل گئی چاہے ان میں باہمی اختلاف واضطراب کی بھرمار ہی کیوں نہ ہو۔ مگر عطاء بن میناء اور ابو صالح ذکوان والی دونوں روایتیں امام مسلم کے سوا اور کسی کو نہ ملیں۔ اور یہ ابن آدم والی روایت ابوداؤد کے سوا کسی دوسرے ابن آدم کو نہ مل سکی۔ کیا یہ باتیں اس کو صاف طور سے نہیں بتا رہی ہیں کہ دراصل بیاری حدیثیں ان کتابوں میں بعد کو داخل کر دی گئیں ان کتابوں کے جامعین ان حدیثوں کے بالکل ذمہ دار نہیں۔ اس سلسلے میں جو ہمام بن یحییٰ البصری ہیں یہ ضعیف الحدیث ہیں۔ یحییٰ بن سعید ان سے روایت نہیں کرتے تھے۔ انکی کتاب سے جو حدیث روایت کرتے تھے اس کو تو محدثین درست سمجھتے تھے اور جو زبانی بیان کرتے تھے اس کو لیس بشئ سمجھتے تھے۔ سلسلۂ اسناد میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ انھوں نے ہدبہ بن خالد سے یہ حدیث کتاب دیکھ کے بیان کی تھی۔ اور بظاہر قرینہ بھی یہی ہے کہ زبانی ہی بیان کی ہوگی اس لئے یوں بھی یہ حدیث لیس بشئ ہے اور قتادہ کی تدلیس سے کون واقف نہیں اسلئے کیا معلوم کہ قتادہ سے واقعی کس نے کہا تھا اور قتادہ نے کس کا بیان کر نا ظاہر کیا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے جتنی حدیثیں نزول عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے متعلق مروی تھیں ان پر تنقیدی بحث میں کر چکا۔ اب تیسری قسط میں انشاء اللہ ان حدیثوں کی تنقید آپ کے سامنے آئے گی جو حضرت ابوہریرہ کے علاوہ دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کی گئی ہیں جن کے اسماء گرامی اسی مضمون میں پہلے میں بیان کر چکا ہوں۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

معذرت

کراچی میں اگست کا پورا مہینہ بارشوں میں گذرا اور ان بارشوں نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کو متاثر کیا وہاں ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والی دو اہم کتابوں

سلیم کے نام خطوط　اور　**قرآنی فیصلے**

کی تیاری پر بھی اثر ڈالا جس کی وجہ سے کتابوں کی ترسیل میں غیر متوقع طور پر تاخیر ہوگئی۔ ہم اس تاخیر پر احباب سے بدل معذرت خواہ ہیں۔

ادارۂ طلوع اسلام
کوی روڈ۔ (نزد پیراڈائز سینما) ۔ کراچی

ادارۂ طلوعِ اسلام کی تازہ پیشکش

جشن نامے

مسکراہٹوں اور آنسوؤں کا مرقع۔ نشتروں اور مرہموں کا مجموعہ۔ ہماری چھ سالہ آزادی کی زندگی پر محتبانہ تبصرہ اور ہمارے دکھوں کا مشفقانہ مداوا۔ اردو لٹریچر میں اس نوعیت کی کوئی دوسری کتاب نہیں ملے گی۔

فہرست عنوانات ملاحظہ کیجئے۔

پنکھڑیاں

انسانیت کی موت۔
اے چشم اشکبار ذرا دیکھ تو سہی / پھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو
جب ہماری حکومت آئیگی تو۔
ذرا سوچئے۔
پاکستانی مٹکے۔
ملاح کی اصلاح۔
ہماری رفتارِ ترقی۔
آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے / کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے
قوم کے غم میں۔

لیڈرانیاں۔
مجاہدانہ رنگینیاں۔
آدمی نہیں ملتے۔
رکھشا والا
چائے کا دور
چائے کا دور (تصویر کا دوسرا رُخ)
شاعری نے مارڈالا اس قوم کو
اتاترک کا آخری پیغام
ہر شخص چاہتا ہے کہ
مظلومینِ کشمیر کی یاد میں تفریحات
" " " پارٹیاں
اسلامی حکومت
رام داس

تھیٹر کے جوکر۔
مادرِ پدر آزادی۔
مجبوریاں۔
پارٹیاں
محفلِ نمائش
پاکستان کا نیا کلچر
تمام شہر ہی دو چار دس کی بات نہیں
رکھشا والا
اہم تبدیلی
نظریۂ اضافیت

جشن نامے

جشنِ آزادی ۱۹۴۸ء

نذرِ عقیدت۔
۱۵ اگست۔
جشن آزادی ۱۹۴۹ء
۱۵ اگست کا پیغام
جشن آزادی
جشن آزادی ۱۹۵۰ء
۱۵ اگست کا پیغام
جشن آزادی
جشن آزادی ۱۹۵۱ء
جشن آزادی ۱۹۵۲ء
یہ ہمارا خواب تھا
یہ خواب کی تعبیر ہے
جشن آزادی

ضخامت ۲۵۶ صفحات۔ مجلد معہ گرد پوش۔ قیمت اڑھائی روپے

بہت جلد طلب کیجئے کیونکہ کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے کتاب محدود تعداد میں چھاپی گئی ہے۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کوی روڈ (نزد پیراڈائز سنیما) کراچی

ایمان کی پہچان

نیک کاموں کے لئے ایماں ہے شرطِ اولیں
بے یقینِ راہ اٹھ سکتا نہیں کوئی قدم

گر نہیں ایماں تو پھر کیا ہے عیارِ خیر و شر؟ یا نظر سود و زیاں پر یا خیالِ مدح و ذم
گر نہیں ایماں تو کیسی خدمتِ خلقِ خدا؟ مصلحت لطف و عطا، سوداگری دستِ کرم
گر نہیں ایماں تو روزہ ہے فقط فاقہ کشی اور رکوع و سجدہ ہیں رقصِ بدن کے پیچ و خم
گر نہیں ایماں تو حج اک طرح کا سیر و سفر اور زکوٰۃ اک مفت کا نقصانِ دنیا رود رم

گر نہیں ایماں تو ہے زہد و ریاضت بھی ریا
گر نہیں ایماں تو سب اعمالِ نیکو کا لعدم

ہاں عمل کے واسطے ایماں ضروری ہے مگر صاحبِ ایماں نہیں کیا ہر مسلماں بیش و کم؟

کیا خبر آخر ہے کیا پہچان اُس ایمان کی ؟
جو کہ ہے حُسنِ عمل کے واسطے اتنا اہم

سب کو ہے ایماں کا دعویٰ، دیکھنا لیکن یہ ہے کس قدر حق کی نظر میں ہے اس ایماں کا بھرم

صاحبِ ایماں نہیں نزدِ خدا جب تک کہ ہم
اپنے جھگڑوں میں نہ ٹھیرائیں پیمبرؐ کو حَکَم

لیکن اب یہ شرطِ ایماں کس طرح پوری کریں؟ جب نہیں موجود اپنے درمیاں میرِ امم

کس طرح حاصل کریں اِس وقت اُن کا فیصلہ؟
کس طرح لے جائیں جھگڑے آج اُن کے پاس ہم؟

گو نہیں ہیں آج پیغمبرؐ ہمارے درمیاں ہے کتاب و سنت آخر تا قیامت محترم
اُن کے پہنچائے ہوئے احکام ہیں درجِ کتاب
اُن کی سنت سے مگر بیگانگی ہے یک قلم

ہے کتاب اللہ تو بے شک ہمارے سامنے لفظ سنت کا مگر مطلب نہیں سمجھے ہیں ہم
ہے اگر پابندئ سنت نبیؐ کی پیروی
ترکِ سنت کی مسلمانوں پہ تہمت ہے ستم!

ان کی سنت اک جماعت، ان کی سنت اک امیر ان کی سنت اک حکومت، ان کی سنت اک حَکَم
جب تک اس سنت کی پوری پیروی ہوتی نہیں دیکھ سکتے ہی نہیں ہیں صورت اسلام ہم
ہے اساسِ ملتِ اسلام آئین و امیر صورتِ ملت کہاں جب ہوں نہ یہ دو تو بہم
بے امیر آئین جاری ہو نہیں سکتا کہیں اور ہے بے آئین آمر پیکرِ جور و ستم
رمزِ حبل اللہ کیا ہے؟ ربطِ آئین و امیر ہے یہی رسّی جو ملت کو ملاتی ہے بہم
اصلِ آئین آج بھی قرآن میں محفوظ ہے جانشینِ مصطفےٰؐ سے ہیں مگر محروم ہم
جس پہ ملت کے نظامِ زندگی کا ہے مدار پیکرِ ملت میں ہے گویا وہی اک چیز کم
یہ کمی جب تک نہ ہو پوری کہاں تکمیلِ دیں؟ یہ نہ ہو تو شرطِ ایماں کس طرح پہنچے بہم؟
کوششِ تکمیلِ دیں ایمان کی پہچان ہے یعنی اس مقصود کی جانب ہی اٹھے ہر قدم
ہوں فقط احکامِ قرآں کے مطابق فیصلے
اور امیرِ وقت ہو سب اختلافوں میں حَکَم

اسعد ملتانی

طاہرہ کے نام ـــــــ دوسرا خط

پرویز

نہیں طاہرہ! حیوان اور انسان کے بچے میں بڑا فرق ہے۔ حیوان کا بچہ اپنی جبلی خصوصیات (INSTINCTS) کو لیکر پیدا ہوتا ہے جو تربیت سے بدل نہیں سکتیں، اگر کسی کتے کے پلّے کو پیدا ہوتے ہی، جب اس نے ہنوز اپنی آنکھیں بھی نہ کھولی ہوں، بکری کے تھنوں سے چپکا دیا جائے اور وہ اسی کی "گود" میں پرورش پائے، تو اس تبدیلی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ اپنے آپ کو کتا ہی محسوس کرے گا اور کتا بن کر ہی بڑا ہوگا۔ اس میں تمام خصوصیات کتوں کی ہوں گی، بکری کی ایک خصوصیت بھی نہیں ہوگی۔ اس کی جبلت پر نہ بکری کا دودھ اثر ڈالے گا نہ بکری کے بچوں کے ساتھ کھیلنا۔ دور کیوں جاؤ! تم نے اپنی مرغی کے نیچے، بطخ کے اور مرغی کے انڈے رکھے تھے۔ پھر دیکھا تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا تھا؟ انڈوں سے مرغی اور بطخ کے بچے نکلے اور سب کے سب مرغی کے پروں کے نیچے پروان چڑھے۔ لیکن جب پہلی مرتبہ پانی سامنے آیا ہے تو تم نے دیکھا تھا کہ بطخ کے بچے کس طرح اُڑ کر پانی میں جا گھسے تھے اور مرغی بچاری پانی کے کنارے ان کا منہ تکتے رہ گئی تھی۔ اسوقت اس کا اضطراب دیکھنے کے قابل تھا لیکن بطخ کے بچوں کو اس کا احساس تک بھی نہ تھا کہ ان سے کوئی اضطراب انگیز حرکت سرزد ہوگئی ہے۔ ان کے برعکس، مرغی کے بچے پانی کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے۔ مرغی کی پرورش اور چوزوں کی رفاقت نے بطخ کے بچوں پر ذرا بھی تو اثر نہ کیا!

برخلاف اس کے، ایک گنوار عورت کے بچے کو پیدا ہوتے ہی کسی علمی گھرانے میں بھیجدو اور اس علمی گھرانے کے بچے کو گنوار عورت کے سپرد کر دو۔ تم دیکھو گی کہ گنوار عورت کا بچہ مہذب اور شائستہ بن کر اٹھے گا اور اس علمی گھرانے کا بچہ بالکل گنوار اور دہقان بن جائیگا (اس میں شبہ نہیں کہ بچوں پر بعض اثرات موروثی بھی ہوتے ہیں لیکن تعلیم و تربیت اور ابتدائی ماحول کے اثرات موروثی اثرات پر غالب آجاتے ہیں۔ یوں بھی، جنہیں ہم موروثی اثرات کہتے ہیں وہ درحقیقت سوسائٹی (معاشرہ) ہی کے اثرات ہوتے ہیں جو مجموعی طور پر (Accumulatively) نسلاً بعد نسلٍ آگے منتقل ہوتے چلے آتے ہیں) تعلیم و تربیت کے اثرات کا تو یہ عالم ہے کہ ایک شیعہ ماں باپ سکے بچے کو سنیوں کے ہاں پرورش پانے دو۔ وہ سنیوں کے عقائد لیکر بڑا ہوگا۔ حتیٰ کہ ہندوؤں کے بچے کو مسلمان گھرانے کے سپرد کر دو۔ وہ انہی جیسا مسلمان بن جائے گا۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے جس کے لئے کسی نظری بحث کی ضرورت نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کا بچہ (حیوان کے بچے کی طرح) بنا بنایا پیدا نہیں ہوتا۔ وہ وہی کچھ بن جاتا ہے جو اس کا ابتدائی ماحول، تعلیم اور تربیت اسے بنا دے۔ لہٰذا جو قوم یہ چاہے کہ اس کی آنے والی نسل، انسانیت کی درخشندہ صفات کی حامل ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے اسی قسم کا ماحول پیدا کرے۔ بچے کا ماحول وہ گھر ہوتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتا اور پرورش پاتا ہے اور اسکی

تربیت کا گہوارہ اس کی ماں کی آغوش ہوتی ہے۔ میں اس خط میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا ورنہ تمہیں مثالیں دیکر بتاتا کہ علم تجزیہ نفس (Psycho-Analysis) کے ماہرین کس طرح اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بچے نے اپنی مستقبل کی زندگی میں جو کچھ بننا ہوتا ہے وہ بنیادی طور پر اپنی عمر کے ابتدائی دو تین سال میں بن چکتا ہے۔ ڈاکٹر جنگ (JUNG) کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ اس کے کیریکٹر کی بنیادیں اس عمر میں استوار ہو چکتی ہیں جب وہ ہنوز بولنا بھی نہیں سیکھتا۔ اس عمر میں وہ نہایت خاموشی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس ماحول کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جس میں وہ پرورش پاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی زندگی کی عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہے۔ لہٰذا بچے کی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ کا بیشتر انحصار اس کے ماحول پر ہوتا ہے اور اس کے ماحول کا انحصار ہوتا ہے اس کے ماں باپ کے باہمی تعلقات پر۔ بلکہ یوں سمجھو کہ یہ ماحول ترتیب پاتا ہے میاں اور بیوی کے باہمی تعلقات سے۔

یہ وجہ ہے کہ قرآن، میاں اور بیوی کے تعلقات کی خوشگواری کو عائلی زندگی کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس سے نہ صرف اس ایک جوڑے کی زندگی ہی مسرتوں کے جھولے جھولتی آگے بڑھتی ہے بلکہ ان کے بچے، اس مساعد ماحول میں پرورش پاکر اپنی ملت کے لئے باعثِ فخر اور انسانیت کے لئے وجہ سعادت بنتے ہیں۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات اسی صورت میں خوشگوار رہ سکتے ہیں جبکہ ان دونوں میں مزاج، خیالات، مقاصد کی ہم آہنگی اور "راستے اور منزل" کی یکسانیت ہو۔ اس قسم کے قلب و نگاہ کی ہم آہنگی اور یک نگہی رکھنے والے مرد و عورت کا یہ باہمی عہد کہ ہم دونوں مل کر ایک ایسا متوازن اور خوشگوار ماحول پیدا کریں گے جس میں پرورش پاکر ہمارے بچے شرف انسانیت کا حسین پیکر بن کر پروان چڑھیں، قرآن کی اصطلاح میں نکاح کہلاتا ہے۔ نکاح کے لغوی معنی ہیں ایک دوسرے میں اس طرح جذب ہو جانا جس طرح بارش کے قطرے زمین میں جذب ہو جاتے ہیں (نکح المطر الارض) یا یوں گھل مل جانا جس طرح آنکھوں میں نیند گھل جاتی ہے (نکح النعاس عینہ)۔ وہ اس قسم کا معاہدہ کرنے والے جوڑے میں سے ایک کو دوسرے کا زوج قرار دیتا ہے۔ اور (جیسا کہ میں پہلے خط میں لکھ چکا ہوں) زوج کے معنی ہیں ... (Complement) یعنی جس کے بغیر دوسرے کی تکمیل نہ ہو سکے۔ میاں کی تکمیل بیوی سے اور بیوی کی تکمیل میاں سے۔ ان میں ایک کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو دوسرا نامکمل رہ جائے۔

یہ حقیقت کہ وہ عائلی معاہدہ (نکاح) جس میں فریقین میں قلب و نگاہ کی کامل ہم آہنگی ہو، جنتی ماحول کا ضامن ہوتا ہے اور جس میں اس قسم کی ہم آہنگی اور توافق نہ ہو اس کا نتیجہ جہنم کا عذاب ہوتا ہے، قرآن نے جامع انداز میں بیان کی ہے۔ قرآن بالعموم مثال پیش کرنے میں انتہائی صورت (Extreme cases) کو سامنے لاتا ہے تاکہ اس سے نیچے دوسری صورتیں خود بخود اس سے (Cover) ہو جائیں۔ اس کے نزدیک اختلاف قلب و نگاہ اور تضادِ فکر و نظر کی شدید ترین صورت شرک اور توحید ہے ..... لہٰذا ایک مشرک اور موحد تصوراتِ زندگی اور نظریاتِ حیات کی رو سے، ایک دوسرے سے یکسر متضاد کناروں پر کھڑے ہوتے ہیں جن میں باہمی توافق کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اس نے ایک مشرک اور مومن کے نکاح کا خیال کرنے والوں کے متعلق کہا کہ اس قسم کے متضاد عناصر کو اکٹھا کرنے والے جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں (اولئک یدعون الی النار)۔ ان کے برعکس خدا کا قانون

ہم آہنگ عناصر کو یکجا کرنے سے جنت کی طرف دعوت دیتا ہے اور ایسا سامانِ حفاظت فراہم کرتا ہے جس سے معاشرہ تباہی اور بربادی سے بچ جائے (واللہ یدعوا الی الجنۃ والمغفرۃ۔ ۲/۲۲۱) اس نے بتا دیا کہ نکاح سے مقصد یہ ہے کہ باہمی سکون حاصل ہو (لتسکنوا الیہا ۳۰/۲۱) اور میاں بیوی میں مؤدت اور رحمت کے تعلقات پیدا ہوں (وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ۔ مؤدت اور رحمت کے الفاظ کا مفہوم سابقہ خط میں لکھا جا چکا ہے)۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا تعلق جس کی بنیاد ہم آہنگیٔ فکر ونظر اور یک رنگیٔ خیالات وتصورات پر ہو، تراضی مابین (Mutual Agreement) ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نکاح کو معاہدہ سے تعبیر کیا ہے۔ (واخذن منکم میثاقا غلیظا۔ ۴/۲۱)۔ معاہدہ کی پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ فریقین بالغ ہوں۔ نابالغ کا معاہدہ درخورِ اعتنا ہی نہیں ہوتا۔ اسی لئے قرآن کی رو سے صغیر سنی کا نکاح، نکاح ہی نہیں ہوتا۔ قرآن نے تو بلوغت کے معنی ہی "نکاح کی عمر" بتائے ہیں (وابتلوا الیتٰمیٰ حتیٰ اذا بلغوا النکاح ۴/۶)۔ معاہدہ کی دوسری شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ بلاجبر واکراہ (فریقین کی پسندیدگی کے مطابق) ہو۔ اسی لئے ایک طرف مردوں سے کہدیا کہ فانکحوا ما طاب لکم من النساء (۴/۳) "عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو"۔ اور دوسری طرف عورتوں کے متعلق کہدیا کہ لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا (۴/۱۹) "تمہارے لئے قطعاً جائز نہیں (حلال نہیں) کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ"۔

لہٰذا نکاح نام ہے ایک بالغ مرد اور عورت کے برضا ورغبت باہمی معاہدہ کا کہ ہم ایک دوسرے کے رفیق بن کر ان تمام حقوق و فرائض کا احترام کرتے ہوئے جو قرآن نے عائد کئے ہیں سکون ومحبت اور ہم آہنگی ویکجہتی کی زندگی بسر کرینگے اور اس طرح معاشرہ میں ایک ایسا خوشگوار ماحول پیدا کریں گے جس میں پرورش پا کر ہماری آئندہ نسل متوازن شخصیت کی حامل اور شرفِ انسانیت کی پیکر بنے۔ اگر ان میں سے ایک شق کی بھی کمی ہو تو وہ نکاح کا تعلق نہیں رہتا۔ محض جنسی اختلاط کا (Biological) ذریعہ رہ جاتا ہے۔ ان دونوں قسم کے تعلقات میں جو بنیادی فرق ہے اس کی تصریح خود قرآن نے کر دی ہے۔ اس نے کہا کہ ازدواجی تعلق کا مقصد ہے (محصنین غیر مسافحین ۴/۲۴)۔ قرآن کا یہ انداز بڑا بلیغ ہے کہ وہ ایک بات کی وضاحت اس کی متضاد بات کو سامنے رکھکر (By Juxtaposition) کر دیتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ازدواجی تعلقات کا مقصد محصنین ہے مسافحین نہیں ہے۔ یہاں محصنین کی وضاحت مسافحین نے کر دی ہے سفح (جس سے مسافحین آیا ہے) کے معنی ہیں بہانا (Pouring out) اور حصن کے معنی ہیں اپنے آپ کو پابندیوں میں رکھنا۔ اگر ان پابندیوں کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا جن کی بنیادوں پر رشتۂ نکاح استوار ہوا تھا تو وہ نکاح نہیں رہتا محض سفح رہ جاتا ہے جس کا مقصد جنسی مادہ کا بہا دینا ہے۔

اب اس سے آگے بڑھو۔ جب نکاح کا مقصد باہمی رفاقت ومؤدت کی زندگی بسر کرنا اور اولاد کے لئے ایسا ماحول پیدا کرنا ہے

لہ عربوں میں قرعہ اندازی تیروں کے ذریعے کیا کرتے تھے۔ وہ باقی تیروں کے ساتھ ایک تیر ایسا بھی پھینکتے جس کے ساتھ کوئی حصہ وابستہ نہیں ہوتا تھا یعنی (Blank) اس تیر کو السفیح کہتے تھے۔ یعنی جو تیر کی طرح چلے تو ضرور لیکن نتیجہ کچھ مرتب نہ ہو۔

جس میں ان کے جوہرِ انسانیت بالیدگی حاصل کریں، تو ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے رفاقت و مؤدت تو ایک طرف، سارا گھر جہنم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دوسری بیوی کا سوال اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب پہلی بیوی فوت ہو جائے (اور یہ یقین ہو کہ دوسری بیوی سے اولاد کے لئے ناسازگار ماحول نہیں پیدا ہو جائے گا) یا ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن میں معاہدہ نکاح فسخ ہو جائے (جسے طلاق کہتے ہیں اور جس کا تفصیلی ذکر ذرا آگے چل کر آتا ہے) چنانچہ قرآن نے طلاق کے ضمن میں یہ کہا ہے کہ (وان اردکما استبدال زوج مکان زوج ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۰/۴) "اگر تم پہلی بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو تو ۔ ۔ ۔ ۔" اس سے ظاہر ہے کہ دوسری بیوی پہلی بیوی کی جگہ ہی آسکتی ہے اس کی موجودگی میں نہیں آسکتی۔

میں یہ لکھ رہا ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس اضطراب کا بھی اچھی طرح اندازہ کر رہا ہوں جو ان سطور کے پڑھنے سے تمہارے دل میں تلاطم خیز ہوگا۔ تم یقیناً کہو گی کہ میں یہ دنیا جہان سے نرالی بات کیا کہہ رہا ہوں؟ مسلمانوں میں چار بیویوں تک کی اجازت "اسلام کے مسلمات" میں سے ہے۔ گذشتہ زمانہ کو چھوڑو۔ اس وقت بھی لاکھوں گھرانے ایسے ہیں جہاں ایک شوہر کی ایک سے زیادہ بیویاں موجود ہیں۔ اور ان گھرانوں میں بڑے بڑے مقدس خانوادے بھی شامل ہیں۔ پھر میں نے کیسے کہہ دیا کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

تم بھی سچی ہو، طاہرہ! اور میں بھی سچا ہوں۔ تم یہ کہہ رہی ہو کہ مسلمانوں میں بیک وقت چار چار بیویاں کر لینے کا **معمول** ہے اور میں یہ کہہ رہا ہوں کہ قرآن کی رُو سے معمولاً ایک وقت میں ایک ہی بیوی کی اجازت ہے۔ اب تم یہ پوچھو گی کہ مسلمانوں میں ایک وقت میں دو دو، تین تین، چار چار بیویاں کر لینے کا معمول کیسے ہو گیا؟ یہ بھی سُن لو۔

قرآن میں ایک جگہ، ایک سے زیادہ بیویوں کا ذکر آتا ہے اور وہ ہے سورۂ نساء کی **تیسری** آیت۔ اس سورہ کی **دوسری** آیت میں ہے:

وأتوا الیتٰمیٰ اموالھم ولا تتبدلوا الخبیث بالطیب ولا تاکلوا اموالھم الی اموالکم انہ کان حوبًا کبیرًا (۴/۲)

یعنی جو بچے یتیم رہ جائیں اور ان کی کوئی جائداد ہو تو ان کے اس مال کی حفاظت اس طرح کرو جس طرح تم اپنے بچوں کے مال کی حفاظت کرتے ہو۔ پھر جب وہ بڑے ہو جائیں تو ان کی امانت ان کے سپرد کر دو۔ یہ نہ کرو کہ ان کی اچھی اچھی چیزیں اپنی نکمی چیزوں سے بدل لو۔ ان کے اموال میں کسی قسم کی دست اندازی کرنا بڑی ہی بے انصافی کی بات ہے۔

یہ ہے سورۂ نساء کی دوسری آیت۔ اس کے بعد تیسری آیت یہ ہے:

وان خفتم الا تقسطوا فی الیتٰمیٰ فانکحوا ما طاب لکم من النساء[1] مثنیٰ وثلٰث وربٰع (۴/۳)

اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

---

[1] ما طاب لکم من النساء کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم ان عورتوں میں سے جو تمہارے نکاح میں آنا پسند کریں، نکاح کر سکتے ہو۔

اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو تم دو دو، تین تین، چار چار عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں نکاح کر سکتے ہو۔

یہاں سے ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت مشروط (Conditional) ہے۔ اور وہ شرط یہ ہے کہ "اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو" ایسا کر سکتے ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اس شرط سے مفہوم کیا ہے؟ اس مفہوم کی طرف سورۂ نساء نے خود ہی اشارہ کر دیا ہے۔ اس سورہ کے شروع میں یتیموں اور عورتوں سے متعلق احکام اور ترکہ و وصیت کے قوانین درج ہیں۔ اس کے بعد جنگ سے متعلق امور کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تم ذرا سوچو کہ مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کو ہجرت کے بعد سات آٹھ سال کے عرصے میں چھوٹی بڑی اسّی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کی جماعت میں مردوں کی کمی ہو جائے اور بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھ جائے۔ ایک مختصر سے معاشرے میں ان یتیموں اور بیواؤں کی موجودگی ایک اہم تمدنی مسئلہ (SERIOUS SOCIAL PROBLEM) بن گیا تھا جس کا تسلی بخش حل نہایت ضروری تھا۔ اگر سوال صرف خورونوش تک کا ہوتا تو اس کے کئی حل سوچے جا سکتے تھے لیکن اصل سوال یتیم لڑکیوں اور نوجوان بیواؤں کے (DISPOSAL) کا تھا۔ اس کے لئے غیر معمولی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت تھی بالخصوص اس لئے کہ ان عورتوں کی شادی اپنی جماعت سے باہر ہو نہیں سکتی تھی۔ مسلمان عورتوں کی شادی نہ مشرکینِ قریش کے ساتھ جائز تھی اور نہ ہی یہود و نصاریٰ کے ساتھ۔ یہ تھے وہ ہنگامی حالات جن کے لئے مندرجہ صدر راہ نمائی ملی۔ یعنی اگر تم دیکھو کہ حالات ایسے پیدا ہو چکے ہیں کہ یتیموں کا مسئلہ اس طرح حل نہیں ہو سکتا کہ ان کے تمام حقوق اور تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کیا جا سکے تو پھر اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کہ ایک مرد ایک سے زیادہ عورتوں کی کفالت اور نگہداشت اپنے ذمے لے لے اور اس طرح معاشرہ کو ان خرابیوں سے بچا لیا جائے جو نوجوان بیوگان کو بلا سرپرست اور ان کے یتیم بچوں کو بلا وارث چھوڑنے سے پیدا ہو سکتی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ایسا کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھ لو کہ اس سے کہیں تمہارے گھر کا توازن تو نہیں بگڑ جائے گا۔ اگر اس کا اندیشہ ہو تو پھر اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت کے ساتھ ہی ہے (فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ ۔۔۔) "اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل قائم نہیں رکھ سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی رہے گی۔"

یہ ہے عزیزہ! سارے قرآن میں تعدد ازدواج (ایک سے زیادہ بیویوں) سے متعلق آیت اور یہ ہے اس کا پس منظر۔ اس کے بعد تم خود ہی سوچو کہ جس طرح مسلمان دھڑا دھڑ شادیاں کرتے ہیں، قرآن سے کسی طرح بھی ان کے جواز کی شکل نکل سکتی ہے؟ ان کے ہاں کوئی شادی بھی ایسی ہوتی ہے جس میں قرآن کی شرط (ان خفتم الا تقسطوا فی الیتٰمٰی ۔۔۔ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو ایک سے زیادہ بیویاں کر سکتے ہو) کا کہیں شائبہ تک بھی ہو؟ اس آیت کی آڑ میں، عام حالات میں، بلا مشروط، تعدد ازدواج کا جواز پیدا کرنا، قرآن کی کھلی ہوئی تکذیب نہیں تو اور کیا ہے؟ کسی سے پوچھو تو وہ کہہ دیتا ہے کہ صاحب! میرے ہاں اولاد نہیں تھی اس لئے میں نے دوسری شادی کر لی ہے! گویا اللہ میاں نے انہیں مکلف ٹھہرایا تھا کہ تم کو فرزندانِ آدم کی تعداد میں اضافہ کر کے مرنا ہے اور کہہ دیا تھا کہ اگر ایسے ہی ہمارے ہاں آ جاؤ گے تو نہیں جہنم میں بھیج دیا جائے گا! اس کے

برعکس، خدا نے خود کہدیا ہے کہ اولاد قانونِ طبعی کے مطابق پیدا ہوتی ہے۔ کسی کے ہاں لڑکیاں، کسی کے ہاں لڑکے، کسی کے ہاں لڑکے لڑکیاں دونوں۔ اور کسی کے ہاں اولاد ہوتی ہی نہیں۔ یجعل من یشاء عقیماً۔ (۴۲/۵۰)۔

بعض کہدیتے ہیں کہ صاحب! بیوی دائم المریض تھی اس لئے دوسری شادی کرلی ہے۔ یعنی ان کے نزدیک رفاقت سے مفہوم یہ ہے کہ جب تک رفیق تندرست رہے، اسے ساتھ رکھا جائے اور جب وہ بیمار ہوجائے تو اسے جہنم رسید کردیا جائے۔

لیکن اس قسم کے عذرات بھی (خواہ وہ بار ہی کیوں نہ ہوں) اس طبقے کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں جو سمجھتا ہے کہ انسانی معاملات کے لئے کوئی نہ کوئی وجہ جواز ہونی ضروری ہے۔ مذہب پرست طبقہ کسی عذر کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس کا جواب صاف ہے کہ جب مذہب نے چار بیویوں کی اجازت دے رکھی ہے تو اس سے بڑھ کر اور کونسی وجہ جواز چاہئے؟ چنانچہ اس طبقے کا حال یہ ہے کہ پہلے چار تک کی تعداد پوری کرلیتے ہیں۔ اس کے بعد ان میں سے کسی ایک کو طلاق دیکر جگہ خالی کرلی جاتی ہے اور پھر خالی جگہ ایک نئی نویلی دلھن سے پُر کرلی جاتی ہے۔ اس طرح نکاح اور طلاق کے احکام کی پابندی سے ثواب بھی ملتا رہتا ہے اور چار بیویوں کی تحدید بھی قائم رہتی ہے۔ یخدعون اللہ والذین اٰمنوا وما یخدعون الا انفسھم ولکن تشعرون۔ یہ لوگ اللہ کے قانون اور اس کے ماننے والی جماعت کو دھوکا دینا چاہتے ہیں مگر ان کا یہ دھوکا خود اپنے آپ کو ہوتا ہے لیکن وہ اس بات کو سمجھتے نہیں ہیں۔

بہرحال، اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لو کہ قرآن میں ایک سے زیادہ بیوی کے اجازت کے سلسلے میں صرف وہی آیت ہے جسے میں نے اوپر درج کردیا ہے اور جو ایک اجتماعی مسئلہ کے حل کے لئے ہنگامی تدبیر کے طور پر آئی تھی۔ یہ فیصلہ کہ اس طرح کے ہنگامی حالات پیدا ہوچکے ہیں یا نہیں، معاشرہ (نظام) کے طے کرنے کی ہوگی نہ کہ افراد کے از خود فیصلہ کرنے کی۔ لہذا جہاں تک افراد کا تعلق ہے، اپنے طور پر ایک سے زیادہ بیوی کرنے کی اجازت کہیں نہیں۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھو۔ یہ تم نے دیکھ لیا کہ قرآن کی رو سے نکاح کی غایت رفیقانہ زندگی بسر کرنا ہے۔ جب تک رفاقت موجود ہے، نکاح کا مقصد پورا ہو رہا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ میاں بیوی میں کسی وجہ سے رفاقت نہ رہے اور نہ ہی اس کے پیدا ہونے کی امید ہو، تو پھر کیا ہو؟

پھر کیا ہو؟ علیحدگی۔ اور کیا ہو؟ متضاد عناصر کو زبردستی جکڑے رکھنے کا نتیجہ سوائے فساد کے اور کیا ہوسکتا ہے۔ اسی لئے تو قرآن نے نکاح کو معاہدہ قرار دیا ہے۔ اس علیحدگی کا نام قرآن کی اصطلاح میں طلاق ہے۔ یعنی معاہدہ کی پابندیوں سے آزاد ہوجانا۔ لیکن قرآن نے جس طرح معاہدہ کرنے کیلئے اتنی تاکید کی ہے کہ یہ قدم یونہی، بلا سوچے سمجھے نہ اٹھایا جائے بلکہ نہایت ٹھنڈے دل سے، تمام احوال و ظروف پر اچھی طرح غور کرکے، سمجھ سوچکر معاہدہ کیا جائے۔ اسی طرح اس نے فسخِ معاہدہ کے لئے بھی ایسی ہی تاکید کی ہے کہ یہ فیصلہ بھی نہایت ٹھنڈے دل سے سب کچھ سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے۔ قرآن کے نزدیک عائلی زندگی کا مسئلہ اسقدر اہم ہے کہ اس نے فسخ نکاح کے طریق کی جزئیات تک خود ہی متعین کردی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں اختلاف ہوجائے تو انھیں چاہئے کہ باہمی افہام و تفہیم سے معاملہ کو سلجھالیں لیکن اگر بات اس سے آگے بڑھ جائے اور اختلاف، کشیدگی کی صورت اختیار کرجائے تو پھر قرآن اس معاملہ کو انہی دونوں پر نہیں

چھوڑ دیتا بلکہ اسے ایک اجتماعی، تمدنی مسئلہ بنا کر معاشرہ سے کہتا ہے کہ تم اسے سلجھانے کی کوشش کرو۔ وان خفتم شقاق بینھما (اگر تمہیں خدشہ ہو کہ میاں بیوی میں تفرقہ پڑ جائے گا) وابعثوا حکماً من اھلہ وحکماً من اھلھا (تو تمہیں چاہئے کہ ایک ثالثی بورڈ مقرر کرو جس کا ایک ممبر شوہر کے گھرانے کا ہو اور ایک ممبر بیوی کے خاندان سے) ان یریدا اصلاحاً یوفق اللہ بینھما (اگر یہ پنچ اصلاحِ حال کی کوشش کریں گے تو خدا کا قانون ان کی موافقت کی شکل کو قائم رکھے گا) کیونکہ مقصود باہمی اختلاف کو رفع کر کے موافقت پیدا کرنا ہے نہ کہ یہ کوشش کرنا کہ ان کے تعلقات منقطع ہو جائیں۔ لیکن اگر اس ثالثی بورڈ کی کوششیں ناکام رہیں اور وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ ان کی باہمی رفاقت ممکن نہیں تو وہ اپنی رپورٹ عدالت کے سامنے پیش کر دینگے۔ (اور اگر انہی کو آخری فیصلہ کا اختیار ہوگا تو خود ہی فیصلہ کر دینگے) اس طرح یہ معاہدہ فسخ ہوگا۔

یہاں پہنچ کر تم پوچھو گی کہ اگر قرآن کی رو سے طلاق اس طرح ہوتی ہے تو یہ جو ہمارے ہاں ہو رہا ہے کہ کسی دن ہنڈیا میں نمک زیادہ پڑ جانے[1] پر میاں کو تاؤ آ گیا اور اس نے کہدیا "طلاق۔ طلاق۔ طلاق"۔ تو بیوی بچاری روتی دھوتی ماں باپ کے گھر جا بیٹھی۔ تو یہ کیا ہے؟۔ یا یہ کہ میاں بیوی میں سخت نزاع ہے۔ دونوں الگ ہو جانے پر راضی ہیں۔ لیکن میاں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ اسے نہ طلاق دیگا نہ گھر بسائے گا اور اسی طرح رلا رلا کر مارے گا۔ تو یہ کیا ہے؟

یہ وہی نداق ہے جو دین کے ساتھ ہو رہا ہے، اور کیا ہے؟ اور اس کے تحت جذبہ وہی کارفرما ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ تمام اختیارات انہی کو حاصل ہیں۔ عورتیں ان کی لونڈیاں ہیں۔ یہ ان پر داروغہ ہیں۔ جب تک داروغہ صاحب کے پسند خاطر ہو اعورت کو گھر میں رکھا۔ جب غصہ آ گیا نکال باہر کیا۔ یا اسے معلق چھوڑ دیا کہ نہ اسے بیوی کی طرح رکھا جاتا ہے نہ مطلقہ کی طرح چھوڑا جاتا ہے۔ ان کو تو الوں کے نزدیک عورت کی حیثیت کیا ہے جو اتنا بھی پوچھ سکے کہ بای ذنب قتلتنی۔ آخر کس جرم کی پاداش میں مجھے ذبح کیا جا رہا ہے؟

پھر طلاق کے بعد کیا ہوگا؟ ان دونوں کو اجازت ہوگی کہ چاہیں تو اپنے لئے اور رفیق تلاش کر لیں۔ لیکن اس کے لئے عورت کو تھوڑی سی مدت تک انتظار کرنا ہوگا۔ یہ مدت (جسے عدت کہتے ہیں) عام حالات میں تین ماہ کی ہوگی لیکن اگر وہ حاملہ ہوگی تو پھر وضعِ حمل تک انتظار کرنا ہوگا۔ اس دوران میں اس کے تمام اخراجات کی ذمہ داری اس کے سابقہ شوہر پر ہوگی۔

عدت کے دوران میں عورت کسی سے نکاح نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر اس مدت میں اس کا سابقہ خاوند جس نے اسے طلاق دی تھی اپنے کئے پر پچھتائے تو یہ اس سے دورانِ عدت میں نکاح کر سکتی ہے۔ بس یہ ایک فائق حق ہے جو مردوں کو دیا گیا ہے۔ یعنی مرد کے لئے عدت نہیں اور عورت کیلئے عدت ہے (اور اس کی مصلحت واضح ہے) اس کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ عام اصول تو یہ ہے کہ ولھن مثل الذی علیھن (۲/۲۲۸) جو حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں، بالکل ویسے ہی حقوق عورتوں کے مردوں پر ہیں۔ لیکن عدت کے زمانے میں اس کا سابقہ شوہر اس سے پھر شادی کر سکتا ہے۔ یہ ہے مرد کا زائد حق۔ وللرجال علیھن درجۃ (۲/۲۲۸) اگر زمانۂ عدت میں یا اس کے بعد ان دونوں نے باہمی رضامندی سے پھر رشتۂ نکاح استوار کر لیا تو ان کی ازدواجی زندگی پھر شروع ہو جائے گی۔ اگر

---

[1] یہودیوں کی شریعت میں سالن میں نمک زیادہ پڑ جانے سے بھی "شرعی طلاق" دی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد پھر وہی کشیدگی کی صورت پیدا ہو جائے اور نوبت پھر طلاق تک پہنچ جائے۔ تو اس مرتبہ بھی، عدت کے دوران میں یا عدت کے بعد، ان میں معاہدہ نکاح کی تجدید کا موقع رہے گا۔ (کیونکہ یہ دوسری مرتبہ کی طلاق تھی۔) لیکن اگر اس کے بعد تیسری مرتبہ بھی طلاق تک نوبت پہنچ گئی تو (یہ تیسری طلاق ہوگی جس کے بعد) نہ زمانۂ عدت میں اور نہ ہی اس کے بعد، ان میں باہمی نکاح ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ زندگی کی کشتی کا کھیل ہے۔ بچوں کا کھیل نہیں۔ اب یہ عورت کسی اور سے نکاح کر سکتی ہے، پہلے خاوند سے نہیں۔ [ہاں۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ یہ دوسرا خاوند اسے طلاق دیدے یا یہ بیوہ ہو جائے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کہ یہ پہلے خاوند سے از سر نو نکاح کر لے۔]

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے۔ طلاق کا فیصلہ انفرادی نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ جب مرد کا جی چاہا طلاق دیدی۔ یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے جس کا فیصلہ معاشرتی نظام (عدالت) کی طرف سے ہوگا۔ اس کے لئے جس طرح مرد کو حق حاصل ہے کہ وہ اختلافی صورت میں عدالت کی طرف رجوع کرے اسی طرح عورت کو بھی حق حاصل ہے۔ جس طرح عورت مرد کو مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اسے اپنے نکاح میں رکھے اسی طرح مرد بھی عورت کو مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ اس کے نکاح میں جکڑی رہے۔ نکاح کی غایت اور بنیادی شرط رفاقت ہے۔ اور رفاقت اور جبر متضاد باتیں ہیں۔ جب رفاقت نہ رہے تو نکاح کیسے رہ سکتا ہے؟

یہ ہیں عزیزہ! قرآن کی رو سے نکاح اور طلاق کے احکام۔ ان پر غور کرو اور سوچو کہ ان میں کہیں بھی عورت کے حقوق مردوں سے کم رکھے گئے ہیں اور کہیں بھی مردوں کو عورتوں پر حاکم اور داروغہ بنایا گیا ہے؟ اب رہا تمہارا یہ سوال کہ قرآن کی ان تصریحات کے باوجود، جو کچھ ہمارے ہاں ہوتا چلا آرہا ہے وہ کہاں سے آگیا۔ تو اس کا جواب آسان ہے۔ جہاں سے ہمارا باقی "مذہب" آگیا وہیں سے یہ کچھ آگیا۔ ہمارے ہاں "مذہب" کا کونا گوشہ ہے جو قرآن کے مطابق ہے جو عائلی زندگی کے باب میں اس قدر حیرت ہو؟ دنیا کی ابتدائی سوسائٹی (Primitive Societies) میں بالعموم معاشرہ کا انداز وہ ہوتا تھا جسے (Matriarchal) کہتے ہیں۔ اس میں عورت کی حیثیت خاندان کے حاکم کی ہوتی تھی۔ عربوں کی پرانی معاشرت میں بھی معاشرہ کا یہی نظام تھا۔ لیکن ان کے دائیں بائیں جو دو بڑی بڑی (بازنطینی اور ایرانی) تہذیبیں تھیں ان میں معاشرہ کا انداز (Patriarchal) تھا جس میں حکومت مرد کے پاس رہتی ہے۔ اسلام سے ذرا پہلے، عربوں نے بھی ان تہذیبوں سے متاثر ہونا شروع کر دیا تھا اور ان کے معاشرے میں بھی مرد کی حکومت کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ اسلام آیا تو اس نے نظم معاشرہ کا تصور ہی بدل دیا۔ اس میں نہ حکومت مرد کے لئے تھی نہ عورت کے لئے۔ یہاں دونوں کو مساوی حیثیت دی گئی تھی اور انھیں سفر زندگی میں دوش بدوش چلایا گیا تھا۔ یہ تھے قرآن کے احکام اس کے بعد جب مسلمانوں میں ملوکیت آئی اور ایرانی اور بازنطینی (بالخصوص ایرانی) تہذیب ان کی جلوت اور خلوت میں سرایت کر گئی تو ان کے معاشرہ میں مرد نے حاکم کی حیثیت لے لی۔ یہ وہ دور تھا جب قرآنی اسلام کی جگہ ایک نیا اسلام مرتب ہو رہا تھا اور جو ہمارے ہاں اسوقت تک رائج ہے۔ ہماری عائلی زندگی سے متعلق احکام بھی اسی جدید اسلام کے پیدا کردہ ہیں جن کا قرآن سے کچھ تعلق نہیں۔ چونکہ یہ "اسلام" ملوکیت اور پیشوائیت کا تخلیق کردہ ہے اس لئے اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت استبداد ہے۔ من اور تن دونوں کی دنیا میں استبداد۔ ایسے استبدادی نظام معاشرہ ہیں، جس میں — ہر گرگ کو ہو برۂ معصوم کی تلاش — عورت کو

مقامِ انسانیت کی توقع رکھنا خیالِ خام تھا۔ اسی استبداد کا یہ نتیجہ ہے کہ آج جس جس گھرانے میں عورتوں کو کچھ آزادی ملی ہے انھوں نے گھر کی حکومت کو اپنے ہاتھ میں لیکر مرد سے انتقام لینا شروع کر دیا ہے اور پھر سے اسی (Matriarchal order) کی طرف رخ کر لیا ہے جو عہدِ قدیم کی یادگار ہے۔ رفاقت نہ ہمارے قدیم معاشرے میں ہے نہ اس جدید میں۔ نہ وہ قرآنی خطوط پر متشکل تھا نہ یہ ہے۔ ہمارا سارا معاشرہ اس افراط و تفریط کے جھولے میں جھول رہا ہے۔ اس میں سکون اور قیام کی اس کے سوا اور کوئی شکل نہیں کہ ہم پرانے، انسانوں کے خود ساختہ معاشرہ کو بھی چھوڑیں اور نئی حدود فراموشیوں کو بھی الگ رکھ دیں۔ اور معاشرہ کی بنیاد از سرِ نو قرآن کی حدود پر قائم کریں۔ اسی سے وہ جنت مل سکتی ہے جس سے نکلا ہوا آدم اس طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔

اب رہیں ہمارے معاشرہ کی مظلوم عورتوں کی دکھ بھری کہانیاں۔ سو تم نے تو شاید یہ کہانیاں اپنے قیاس سے لکھی ہیں لیکن میرے سامنے تو اس قسم کے سچے واقعات صبح سے شام تک آتے رہتے ہیں۔ میری حالت تو ایک ڈاکٹر کی سی ہو چکی ہے کہ اس کے پاس جو آتا ہے روتا ہوا آتا ہے۔ ڈاکٹر تو شاید اپنے دل کو کڑا کر لیتے ہیں لیکن مجھے تو تم جانتی ہو کہ میں کسقدر حساس واقع ہوا ہوں بالخصوص عورتوں اور بچوں کے معاملے میں تو میں بہت ہی رقیق القلب ہوں۔ کہنے والا کسی کی بپتا کی کہانی کہہ کر چلا جاتا ہے اور مجھ پر رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ تم کیا جانو طاہرہ! کہ کتنی معصوم لڑکیاں ہیں جو ماں باپ کے سر پر بوجھ بنی بیٹھی ہیں کیونکہ ان غریبوں کے پاس اتنی دولت نہیں جس کا مطالبہ ان "شریفوں اور شریف زادوں" کی طرف سے ہوتا ہے جو انھیں بیاہ کر لے جانا چاہتے ہیں۔ ان بچاریوں کے لب سیئے ہوئے ہوتے ہیں لیکن اپنی حالت کا احساس ان کی ہڈیوں کے گودے تک کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ کتنی مظلوم لڑکیاں ہیں جنھیں ان کی مرضی کے خلاف ان نالائقوں کے ساتھ جکڑ دیا جاتا ہے جن کے متعلق علم ہوتا ہے کہ ان میں دنیا بھر کے عیب موجود ہیں۔ لیکن وہ بچاریاں زبان سے ایک لفظ تک نہیں کہہ سکتیں۔ کتنی معصوم بچیاں ہیں جنھیں ہماری سوسائٹی کے "مہذب بدمعاش" اس قدر تنگ کرتے ہیں کہ وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ جب ان کے زیور کا آخری چھلہ تک بھی چھین لیا جاتا ہے تو انھیں مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنے ماں باپ کے گھر سے روپیہ لائیں اور جب وہ روپیہ نہیں لا سکتیں تو مار مار کر ان کی ہڈیاں توڑ دی جاتی ہیں۔ کتنی لڑکیاں ہیں جنھیں نہ گھر میں بسایا جاتا ہے اور نہ ہی طلاق دی جاتی ہے اور دندناتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ یا تو اتنا روپیہ دو اور یا ساری عمر اسی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو۔ اس سے بھی آگے بڑھو تو کتنی کمزور اور بیمار لڑکیاں ہیں جن کے ہاں بیس بیس سال کی عمر تک چار چار پانچ پانچ بچے پیدا ہو جاتے ہیں اور گھر میں اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ان کا پیٹ بھر سکے۔ وہ دن بھر محنت مزدوری بھی کرتی ہے اور اتنے بچوں کو بھی سنبھالتی ہے اور ساتھ ہی اپنے "مجازی خداوند" کے ظلم بھی برداشت کرتی ہے۔ پھر کتنے ایسے گھر ہیں جن میں غریبی کے زمانے میں تو کسی نہ کسی طرح گذران ہو جاتی ہے لیکن جونہی میاں صاحب کی جیب میں چار پیسے آجاتے ہیں تو ان کے سر پر دوسری شادی کا بھوت سوار ہونا شروع ہو جاتا ہے اور ان بچاریوں کو بچوں سمیت ان کے ماں باپ کے گھر بھیج دیا جاتا ہے۔ اور ولایت جانے والوں کا تو پوچھو ہی نہیں۔ جو گیا آتے وقت ایک میم صاحبہ ساتھ لے آیا۔ اب پہلی بیوی ہے کہ بچوں کو لیکر در بدر ماری ماری پھر رہی ہے اور میم صاحبہ

گلچھرے اڑا رہی ہیں۔ کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں کہ تمہیں ان بے گناہوں کو اس طرح تباہ و برباد کرنے سے ذرا شرم محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن شرم کیسی؟ وہ کہتے ہیں کہ جب "شریعتِ حقہ" نے اس کی اجازت دے رکھی ہے تو کون ہے جو ہمیں ٹوک سکتا ہے؟

ہمارے معاشرہ کے اس عذابِ جہنم کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کی کم از کم ساٹھ ستر فی صدی لڑکیاں دق میں مبتلا ہوتی ہیں اور بچاریاں گھل گھل کر مر جاتی ہیں۔ مجھے ڈاکٹر صاحب ہر دوسرے تیسرے دن آکر بتا دیتے ہیں کہ آج ایک مریضہ لڑکی آئی۔ حالت یہ تھی کہ تپ دق دوسرے تیسرے درجے تک پہنچ چکا ہے لیکن ایک بچہ گود میں ہے اور ایک بطن میں۔ طاہرہ بیٹی! میں تجھے کیا بتاؤں کہ ان واقعات سے مجھ پر کیا گذرتی ہے؟ کسی کے ایک بیٹی ہوگی تو اسے اسی کا غم ستائے گا لیکن میں ان سب بیٹیوں کے غم میں خون کے آنسو روتا ہوں۔ یہ آنسو ان کے غم میں نہیں روتا، اپنی بے بسی پر روتا ہوں۔ جب کسی کے جور و تشدد کی کہانی سنتا ہوں تو جی میں آتا ہے کہ اس ناہنجار کو کتوں سے پھڑوا دوں۔ لیکن اس داستانِ غم کے ختم ہو جانے کے بعد جب سوال یہ آتا ہے کہ اب کیا کیا جائے تو سوائے اس کے کہ سنانے والا بھی روئے اور میں بھی روؤں اور کچھ بن ہی نہیں پڑتا۔ یہ ہے وہ مسلسل جہنم طاہرہ! جس سے تمہارے چچا جان گذر رہے ہیں جن کے متعلق تم نے لکھ دیا کہ "آپ بہت اچھے رہے کہ اللہ میاں نے آپ کو کوئی بیٹی نہیں دی"۔

اب تم پوچھتی ہو کہ اس کا علاج! اس کا علاج انفرادی اصلاح سے تو ہو نہیں سکتا۔ جب کسی معاشرہ کی خرابیاں اس حد تک عام ہو چکی ہوں تو ان کا انفرادی علاج ہوا ہی نہیں کرتا۔ اس کا علاج پورے کے پورے معاشرہ کے بدل دینے سے ہو سکتا ہے۔ وہی چیز جسے قرآن نے "تبدل الارض غیر الارض والسمٰوٰت" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اس زمین کو بدل دیا جائے۔ اس آسمان کو بدل دیا جائے۔ جب تک ہمارے معاشرے کو بدل کر اس کی جگہ قرآنی معاشرہ قائم نہیں کیا جاتا، اصلاحِ حال کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اگر اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن ہو جائے تو قرآن کا یہ دعویٰ باطل ہو جائے کہ انسانوں کا بنایا ہوا کوئی قانون اور کوئی نظام، اس کی جگہ لے ہی نہیں سکتا۔

اچھا۔ خدا حافظ! سلیم کی واپسی کی امید کب تک ہے۔ اسی ڈاک میں اس کے نام بھی ایک خط بھیج رہا ہوں۔ والسلام

پرویز

۱۵ اگست ۱۹۵۳ء

معارف القرآن (جلد سوم)

ہمارے پاس اتفاق سے معارف القرآن کی تیسری جلد کی پانچ کاپیاں آگئی ہیں۔ یہ کتاب اب نایاب ہو چکی ہے اور اس کے نئے ایڈیشن میں بہت وقت لگے گا۔ قیمت بیس روپے فی جلد ہے۔ جن حضرات کی فرمائشیں پہلے پہنچ جائیں گی انہیں کتاب بھیجدی جائے گی۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ کوی روڈ۔ کراچی

حقایق و عبر

۱۔ سرمد "شہید"

جامع مسجد دہلی کے شرقی دروازے کے سامنے، سڑک کے کنارے، ایک قبر ہے جس پر سرخ رنگ کا غلاف چڑھا رہتا ہے۔ یہ قبر "سجدہ گہ عوام و خواص" ہے۔ لوگ دور دور سے اس کی زیارت کو آتے ہیں اسے "سرمد شہید علیہ الرحمۃ" کا مقبرہ کہا جاتا ہے۔ صاحبِ قبر، سرمد، صرف عوام ہی میں شہید کے نام سے مشہور نہیں، خواص بھی اسے شہید ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔ حتیٰ کہ ابوالکلام صاحب آزاد نے اپنے قلم کی تمام رنگینیوں کے ساتھ اس کے خونچکاں کفن کی تصویر کچھ اس انداز سے کھینچی ہے کہ بچارا اورنگ زیب (عالمگیر) جس کی آستین اس "شہید" کے خونِ ناحق کے دھبوں سے داغدار ہے، منہ چھپائے پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ مسلمانوں کی سی جذباتی قوم ہر معاملہ میں "شاعری" کرتی ہے (اور دنیا کی ہر قوم اپنے دورِ انحطاط میں شاعری کیا کرتی ہے) اس لئے انھیں اس سے غرض ہی نہیں ہوتی کہ اس کی تحقیق کرے کہ جس سنگِ آستاں پر ہماری جبینِ نیاز سجدہ ریز ہے وہ کعبے کی دہلیز ہے یا بت خانے کی۔ انھیں تو پرستش سے غرض ہے ـــــ مسجد ہو، مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو ـــــ لیکن حال ہی میں ایک مغربی مورخ (W. J. FISCHEL) نے اس مقبرہ کے سرخ رنگ کے غلاف کو اٹھا کر دکھایا ہے کہ جسے تم "اولیاء اللہ" سمجھ کر پوجتے ہو اور شہید کہہ کر پکارتے ہو وہ درحقیقت ایران کا ایک یہودی تھا جو مسلمانوں کے لباس میں یہاں آیا۔ عمر بھر یہودیت کی تبلیغ کرتا رہا اور اسی فریب دہی کے جرم میں قتل ہوا۔ فشل کا یہ مضمون، حیدرآباد (دکن) کے مجلہ اسلامک کلچر کے جوبلی نمبر میں شائع ہوا ہے۔

اکبر نے جس "برہمو سماجی" اسلام کی داغ بیل ڈالی تھی اور جس کی رو سے بتایا تھا کہ دنیا کے تمام مذاہب یکساں ہیں اور اسلام کو دوسرے مذاہب (یا ادیان) پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ اس کی تکمیل کا بیڑہ دارا شکوہ نے اٹھایا تھا[1]۔ اس کے زمانے (یعنی شاہ جہاں کے عہدِ حکومت) میں ایک ایرانی یہودی ہندوستان آیا۔ یہ کاشان کا رہنے والا تھا اور بظاہر مسلمان ہو کر اس نے اپنا نام محمد سعید یا سعید سرمد رکھ لیا تھا۔ چنانچہ جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں اسے یہودیوں نے سرمد یہودی کہہ کر پکارا ہے اور آخر تک اسے یہودی ہی قرار دیا ہے۔ یہ کاشانی یہودی، سمندری راستے سے ٹھٹھہ (سندھ) پہنچا۔ یہاں وہ ایک ہندو لڑکے (ابھے چند) پر عاشق ہو گیا اور اسی کے عشق میں تجارت اور سوداگری چھوڑ چھاڑ فقیر ہو گیا۔ یہاں سے وہ حیدرآباد پہنچا اور پھر ۱۶۵۰ء میں دہلی گیا۔ حیدرآباد میں اس کی ملاقات "دبستانِ مذاہب" کے مصنف (محسن فانی) سے ہوئی جسے اس کی تلاش تھی کہ کوئی ایسا شخص ملے جس سے یہودیت کے

---

[1] ہمارے دور میں اسی برہمو سماجی اسلام کی صدائے بازگشت "واردھا کی تعلیمی اسکیم" میں بلند ہوئی تھی۔ جس کی سند ابوالکلام صاحب آزاد نے اپنی تفسیر (ترجمان القرآن) میں بہم پہنچادی تھی۔ جو احباب طلوعِ اسلام کے دورِ دہلی سے واقف ہیں انھیں یاد ہوگا کہ طلوعِ اسلام نے اس الحاد کے خلاف کسقدر جہاد کیا تھا اور اسے بتوفیق ایزدی کس قدر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

متعلق معلومات بہم پہنچائی جائیں جن کے بغیر اس کی کتاب ناتمام رہ جاتی تھی۔ چنانچہ دبستانِ مذاہب میں یہودیت سے متعلق باب سرمد یہودی ہی کا لکھا ہوا ہے۔ اس طرح پہلے پہل ہندوستان میں یہودیت کا تعارف ہوا۔

اس کے بعد سرمد کا تعارف داراشکوہ سے ہوا اور یہ تعارف بڑھتے بڑھتے دوستی اور رفاقت تک اور اس سے آگے عقیدت و ارادت مندی کی حد تک پہنچ گیا۔ چنانچہ داراشکوہ اس یہودی کو پیر و مرشد کہہ کر پکارتا تھا۔ سرمد نے فقیرانہ وضع اختیار کر رکھی تھی اور لباس سے بیگانہ رہتا تھا۔ داراشکوہ کے مسلک کی رعایت سے ہمہ اوست قسم کی فقیرانہ باتیں کرتا رہتا تھا لیکن اس کا اصل مقصد یہودیت کی تبلیغ تھا جس کے لئے اسے نہایت اچھا موقعہ مل گیا، اسلئے کہ جسے شاہزادہ داراشکوہ "پیر و مرشد" کہہ کر پکارے اس کے مرجع انام بن جانے میں کسر ہی کونسی رہ سکتی تھی۔ اورنگ زیب نے داراشکوہ کو قتل کرا دیا لیکن سرمد اپنی یہودیت کی تبلیغ سے پھر بھی باز نہ آیا۔ چنانچہ اورنگ زیب کو اس کے خلاف بھی قتل کا حکم دینا پڑا اور اس طرح ۱۶۶۱ء میں اس یہودی کا خاتمہ ہوا۔ اس فتویٰ قتل میں بھی یہ لکھا تھا کہ اگر اس شخص کی سرگرمیوں کو بے لگام رہنے دیا گیا تو نہ معلوم کتنے لوگوں کا اسلام یہودیت سے بدل جائیگا۔

یہ ہے، تحقیقِ جدید کے مطابق "حضرت سرمد شہید علیہ الرحمۃ" کی اصل تصویر۔

آپ طلوع اسلام میں پڑھتے چلے آرہے ہیں کہ اس اسلام کو جسے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کے ذریعہ قرآن کریم کی شکل میں نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے بھیجا تھا، کس طرح تین غیر اسلامی موثرات نے یکسر بدل کر اسے وہ اسلام بنا دیا جسے ہم ہزار برس سے سینے سے لگائے چلے آرہے ہیں اور جس نے ہماری یہ حالت بنا رکھی ہے کہ غالبؔ کے الفاظ میں — بیکسی ہائے تمناکہ نہ دنیا ہے نہ دیں — یہ تین قوتیں تھیں۔ نصرانیت۔ یہودیت اور ایران کی مجوسیت۔ ان قوتوں نے پہلی صدی ہی سے اسلام کو موثر کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کے لئے ان کا انداز یہی تھا کہ یہ مسلمانوں کے لباس میں بڑے بڑے مقدس نقابوں کے پیچھے چھپ کر مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرتے تھے۔ سرمد کے حالات، دیکھکر آپ غور کیجئے کہ ان کی اسلام دشمنی کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہا۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ ہم جن "بزرگوں" کے نام "سلام و رحمت" کے ساتھ لیتے ہیں ان میں سے کتنے "سرمد شہید" ہوں گے! یہ وجہ ہے کہ قرآن نے تمام توجہات اشخاص سے ہٹا کر اپنے قوانین و نظام کی طرف مرکوز کر دی اور گذرے ہوئے لوگوں کے متعلق کھلے کھلے طور پر کہدیا کہ ان کی حیثیت اتنی ہی ہے کہ

تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون (۲/۱۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جو (اپنے اپنے وقتوں میں) چل بسے۔ جو کچھ انھوں نے کیا وہ ان کے لئے ہے اور جو کچھ تم کروگے وہ تمہارے لئے ہوگا تم سے قطعاً یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انھوں نے کیا کیا تھا (تم سے یہی پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا)۔

لیکن صوفی و ملّا نے قرآن کی حیثیت ہی کیا رہنے دی ہے جو اسے درخورِ اعتنا سمجھا جائے! یہ قوم کو ہر بڑی چوکھٹ پر سر جھکانا سکھاتے ہیں تاکہ وہ ان کے سامنے بھی سر جھکائیں۔ وہ قوم کو قرآن کی طرف کیوں آنے دیں جو انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ تیرا سر قانونِ خداوندی کے علاوہ اور کسی کے سامنے نہیں جھکنا چاہئے۔ خواہ وہ کوئی ہو!

۲۔ مُلّا کی حکومت

قارئین طلوع اسلام سے اب یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ جب انسان اپنی مرضی کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں تو خدا رخصت ہو جاتا ہے لیکن جب حکومت مُلّا کی مرضی کے مطابق قائم ہوتی ہے تو خدا اور انسان دونوں رخصت ہو جاتے ہیں اور باقی جہالت اور تمسخر رہ جاتا ہے۔ اس جہالت اور تمسخر کا عبرت انگیز منظر دیکھنا ہو تو فلسطین کی یہودی حکومت کی پارلیمان کی روئداد پڑھئے اور پھر دیکھئے کہ جب کسی قوم کے دل و دماغ پر مُلّا سوار ہو جاتا ہے تو وہ کس قسم کے مسائل کے حل کرنے میں اپنا وقت اور توانائی صرف کرتی ہے۔ ہم نے فلسطین کی حکومت کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ سامی مذاہب میں مُلّا ازم یہودیت ہی کی تخلیق ہے (اور مسلمانوں میں اس تپ دق کے جراثیم بھی وہیں سے آئے ہیں) اور ان کی زندگی میں مُلّا کو ابھی تک بڑا اقتدار حاصل ہے۔

پچھلے دنوں، کاہنوں کی نسل کا ایک نوجوان یہودی لڑکا ایک مطلقہ عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میاں بیوی دونوں راضی تھے لیکن یہودی مُلّا نے کہدیا کہ شریعت کی رو سے ایک کاہن بچہ کی شادی ایک مطلقہ عورت سے اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ اس لڑکے کے جسم کا کوئی حصہ کٹا ہوا ہو۔ اس نے بہتیرا واویلا مچایا لیکن مُلّا کے فتوے کے سامنے شنوائی کس کی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے پاؤں کا انگوٹھا کٹوایا اور اس کے بعد ملا نے اس کا نکاح پڑھایا۔

یہودی شریعت کے مطابق، کسی یہودی کی شادی غیر یہودی سے نہیں ہو سکتی۔ ان کی حکومت قائم ہونے سے پہلے، بعض یہودیوں نے عیسائی لڑکیوں سے شادی کر لی تھی۔ اب اسرائیلی پارلیمان میں مُلّاؤں نے یہ سوال اٹھا رکھا ہے کہ ان شادیوں کو ناجائز قرار دیا جائے۔ ان میں وہاں کے وزیر اعظم کا بیٹا (جو خود پولیس کا ڈپٹی انسپکٹر جنرل ہے) بھی شامل ہے۔

ان کے ملا کی شریعت کا یہ مسئلہ بھی ہے کہ کوئی بے اولاد بیوی، دوسری شادی نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنے متوفی شوہر کے بھائی سے اجازت نہ حاصل کر لے۔ اس شرط نے وہاں عجیب مصیبت برپا کر رکھی ہے۔ جنگ کے دوران میں جب یہودی، جرمنی سے نکالے گئے ہیں تو کوئی بھاگ کر کہاں گیا کوئی کہاں۔ اب ان بیوہ عورتوں کو اپنے متوفی خاوندوں کے بھائیوں کا اتا پتہ معلوم نہیں۔ ان کا سراغ نہیں ملتا اور بلا مصرہے کہ جب تک ان سے اجازت نامہ نہ لاؤ تمہاری شادی نہیں ہو سکتی۔

یہودی شریعت میں سبت کے دن، اپنے آپ پر بہت سی پابندیاں عائد کرنی پڑتی ہیں۔ پچھلے دنوں تک ان پابندیوں پر کچھ زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا لیکن اب جو اقتدار ملا کے ہاتھ میں آیا ہے تو اس نے اپنی شریعت کے نفاذ میں سختی سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ ان ملاؤں کے معتقدین سڑکوں پر پھرتے رہتے ہیں اور جسے دیکھتے ہیں کہ اس نے کوئی پابندی توڑ دی ہے (مثلاً سگریٹ پی لیا ہے) اسے پکڑ لیتے ہیں پیٹتے ہیں۔ پتھر مارتے ہیں۔ موٹر کاروں کو جلا دیتے ہیں۔ جو جی میں آئے کرتے ہیں لیکن ارباب حکومت میں سے کسی کی مجال نہیں کہ ان سے کچھ کہہ سکے۔ اسلئے کہ ایسا کرنا "مداخلت فی الدین" سمجھا جاتا ہے جس کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔

وہاں کی پارلیمان میں کئی کئی دنوں تک اس قسم کے مسائل پر بحث ہوتی رہتی ہے کہ یروشلم کے غیر یہودی باشندوں کو سور پالنے کی اجازت دی جائے یا نہ۔ تعلیم کے معاملے میں حکومت نے چاہا تھا کہ مدرسوں اور مکتبوں کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لے لیکن ملاؤں نے

کہدیا کہ مذہبی مکاتب کو حکومت چھو تک نہیں سکتی۔ چنانچہ ان مکاتب کو مستثنیٰ قرار دینا پڑا۔

یروشلم کے میڈیکل کالج میں تشریح الابدان کی تعلیم کے لئے مُردوں کو چیرا پھاڑا جاتا تھا (جیسا کہ ساری دنیا کے میڈیکل کالجز میں ہوتا ہے) لیکن اب وہاں مُلا نے فتویٰ دیدیا ہے کہ اس سے مردے کی بے حرمتی ہوتی ہے اسلئے یہ ناجائز ہے۔ یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد بہتیرے چیخے کہ اس طرح ہمارے ہاں ڈاکٹر ہی پیدا نہیں ہوسکیں گے لیکن مُلا نے ایک نہیں مان کے دی۔ اس نے کہدیا کہ ملک کو ڈاکٹروں کے بغیر رکھا جاسکتا ہے لیکن مُردوں کی بے حرمتی روا نہیں رکھی جاسکتی۔ [1]

مُلا کے اس بڑھتے ہوئے اقتدار سے بنی اسرائیل کی حکومت اور عام پبلک عجیب پریشانی میں مبتلا ہے۔ ملک بڑی تیزی سے دو گروہوں میں بٹ رہا ہے۔ ایک طبقہ مُلا پرستوں کا ہے اور دوسرا تعلیم یافتہ سمجھدار طبقہ۔ ان کے باہمی تصادم سے ملک میں خلفشار پیدا ہو رہا ہے اور یہودیوں کے ارباب فکر وتدبر اس خلفشار کی وجہ سے بیحد پریشان ہو رہے ہیں کہ اس صورت حالات کا انجام کیا ہوگا؟

قرآن نے مسلمانوں کی توجہ بار بار بنی اسرائیل کی طرف دلائی ہے اور بڑی تاکید سے کہا ہے کہ ان کی حالت سے عبرت پکڑو، ورنہ جس ذلت وخواری کی زندگی یہ بسر کر رہے ہیں تم بھی اسی رسوا کن عذاب میں ماخوذ ہو جاؤ گے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان قدم بہ قدم یہودیوں کے پیچھے چلے حتی کہ ان کا سارا دین یہودیت کے مذہب میں تبدیل ہوگیا۔ اس کا جو کچھ نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے۔ مسلمان یہودیوں سے بھی زیادہ ذلیل وخوار ہوگئے۔ "یہودیوں سے زیادہ ذلت وخواری" کی زندہ مثال تو خود فلسطین کی یہودی حکومت ہے جسے انہوں نے مسلمانوں سے چھین کر حاصل کیا ہے۔ جو قوم یہودیوں سے اپنا ملک چھنوا بیٹھے اس جیسی ذلیل وخوار قوم اور کون ہوگی!

لیکن جو کچھ ہم خاص طور پر کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر ہمارے ہاں بھی اقتدار مُلا کے ہاتھ میں آگیا تو یہاں بھی وہی کچھ ہوگا جو اسوقت فلسطین میں ہو رہا ہے۔ یہاں بھی قوم کی تمام توانائیاں اسی قسم کے "اہم مسائل" کے حل کرنے میں ضائع ہوا کرینگی کہ جو مرغی بانگ دیدے اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں۔ جسے مُلا "نظام شریعت" کہتا ہے وہ اسی قسم کے مسائل پر مشتمل ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ یہودیوں کے مُلا جن مسائل کو حل کرنے میں مصروف ہیں ان کا وجود تورات میں نہیں وہ سب ان کی روایات اور فقہ (مشنا اور جمارا) کے مسائل ہیں جنھیں انھوں نے وحی خداوندی کی مثل قرار دے رکھا ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ یہ عقیدہ کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحیٔ متلو (شکتب) اور دوسری وحیٔ غیر متلو (شبعلفہ)۔ یہودیوں ہی کی ایجاد ہے اور وہیں سے مسلمانوں میں آیا ہے۔ ان کے ہاں وحی غیر متلو (روایات) کو وحی متلو (تورات) کا ہم پایہ (مثلہٗ معہٗ) سمجھا جاتا ہے (جس طرح مسلمانوں میں سمجھا جاتا ہے) اور ان کی شریعت انہی روایات اور ان کی تفاسیر پر مشتمل ہے۔

یہی کچھ آپ کے ہاں ہوگا اگر مُلا اسی طرح آپ کے اعصاب پر سوار رہا تو!

---

[1] آپ کو شاید یاد ہوگا کہ اگلے دنوں کراچی میں بھی اس قسم کی آواز ملازدہ طبقہ کی طرف سے اٹھی تھی۔

باب المراسلات

طلوعِ اسلام اور نماز راولپنڈی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ یہاں ایک مولوی صاحب لوگوں سے کہتے رہتے ہیں کہ طلوع اسلام ایک نیا مذہب ایجاد کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نمازیں پانچ وقت کی نہیں بلکہ تین وقت کی پڑھنی چاہئیں اور روزے مہینے بھر کے نہیں بلکہ صرف نو دن کے رکھنے فرض ہیں۔

طلوع اسلام اس قسم کی اطلاعات ہمیں اور جگہوں سے بھی موصول ہوئی ہیں لیکن مولوی کا یہ حربہ نیا نہیں بہت پرانا ہے۔ اس کی عادت ہے کہ جب اس کے پاس کوئی دلیل نہیں رہتی تو یہ نئے نئے لیبل تراشتا ہے اور انھیں فریقِ مقابل پر چسپاں کر دیتا ہے اور اس طرح اسے جگہ جگہ بدنام کرتا پھرتا ہے۔ آپ جس جگہ اس قسم کی بات سنیں کہنے والے سے اتنا کہیں کہ صاحب! آپ طلوع اسلام کے پرچوں میں کسی جگہ یہ دکھا دیں کہ طلوع اسلام نے کہا ہو کہ نمازیں پانچ نہیں تین پڑھنی چاہئیں اور روزے مہینے بھر کے نہیں صرف نو دن کے رکھنے چاہئیں۔ اس کے بعد ان سے صرف اتنا کہہ دیجئے کہ فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکافرین۔

یاد رکھئے۔ طلوع اسلام نہ کوئی نیا مذہب ایجاد کرنا چاہتا ہے اور نہ ہی کوئی فرقہ بنانا چاہتا ہے۔ البتہ اس کی کوشش یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو کسی طرح ملا کے چنگل سے چھڑا دے جس نے انھیں نہ دین کا رہنے دیا ہے اور نہ دنیا کا۔ اس کے بعد ملا جو کچھ اس کے خلاف کہے، اس کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔

۲۔ ان من اھل الکتاب کی تفسیر میرپور سے محترم بشیر احمد سوی جالندھری تحریر فرماتے ہیں:۔

سورۃ النساء میں ایک آیت ہے جس کو مفسرین حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ آسمان سے نازل ہونے کے عقیدہ کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ وہ آیت یہ ہے: وان من اھل الکتاب الا لیومنن بہ قبل موتہ ویوم القیمۃ یکون علیھم شھیدا۔ (۴/۱۵۹) مفسرین نے جو مطالب پیدا کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنے مرتے وقت (قبل موتہ) حضرت عیسیٰؑ پر ایمان نہ لے آئے (لیومنن بہ)۔ مرتے وقت ایسا ہوتا ہے کیونکہ اس وقت غفلت و شرارت کے تمام پردے ہٹ جاتے ہیں اور حقیقت نمودار ہو جاتی ہے۔

(۲) یہ آیت ایک پیش گوئی ہے یعنی حضرت عیسیٰؑ ابھی زندہ ہیں جب قربِ قیامت میں دجال پیدا ہوگا تب وہ اس دنیا میں دوبارہ

آگراس کو مارین گے اور یہودیوں اور نصاریٰ میں سے جو اس وقت زندہ ہوگا اپنے مرنے سے پہلے (قبل موتہ) یا حضرت عیسیٰؑ کے مرنے سے پہلے (قبل موتہ) ان پر ایمان لے آئیگا (لیومنن بہ) کہ یہ اپنی پہلی بعثت کے زمانے میں رسول تھے اور صلیب پر نہیں مرے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی طرف ایک روایت منسوب ہے جس میں نزول ابن مریم کا ذکر ان کے کارنامے بیان کرنے کے بعد انھوں نے فرمایا کہ اگر تم قرآن سے تائید چاہو تو یہ آیت پڑھ لو (فاقرؤا ان شئتم وان من اھل الکتاب الخ)

(۳) یہ آیت پیش گوئی ہے اس بات کی کہ ضرور ہے کہ ایسا زمانہ آئے جبکہ اہل کتاب اسلام کے عقیدہ کے مطابق مسیح ابن مریم کی نبوت پر ایمان لائیں گے اور اسلام دنیا کا مذہب ہوگا۔

نمبر۱ میں قبل موتہ سے "اپنے مرتے وقت" کا مفہوم لینا صحیح نہیں۔ الفاظ اس کے متحمل نہیں حقیقت میں یہ مفہوم احادیث سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم کی ایک حدیث ہے۔ ان المومن اذا حضرہ الموت بشر برضوان اللہ وکرامتہ وان الکافر اذا حضر بشر بعذاب اللہ وعقوبتہ (مومن کو موت کے وقت اللہ کی خوشنودی کی بشارت ہوتی ہے اور کافر کو اس کے عذاب کی)۔ نیز فرشتے قبض روح کے وقت اہل کتاب کو پکارتے ہیں اور وہ عدم قبول توبہ کا وقت ہوتا ہے"۔ اول تو اس بیان سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مرنے والا اس وقت صحیح ایمان لے آتا ہے دوسرے اگر یہاں اشارہ سورۂ انعام کی آیت ۹۴ (ولوتریٰ اذ الظلمون الخ) کی طرف ہے تو اس سے مراد موت کے بعد کی پیشی اور حیات اخروی کا واقعہ ہے۔ تفصیل اس کی طلوع اسلام کے صفحات پر گذر چکی ہے۔ دیکھو طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۴۹ء باب المراسلات عذاب قبر۔

قبل موتہ کا صحیح مفہوم جو قرآن کی زبان اور لغت و محاورۂ عرب کے مطابق ہو آگے بیان ہوگا۔

نمبر ۲ و ۳ میں جو مطالب بیان ہوئے ہیں وہ بھی سب اخبار و روایات پر مبنی ہیں نہ کہ نص قرآن پر۔ یہی مفسرین یہ بھی لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل قیامت تک ذلیل و خوار اور غیروں کی رعیت بن کر رہیں گے اور نصاریٰ منکرین عیسیٰ (یعنی یہودیوں) پر قیامت تک فائق و غالب رہیں گے (دیکھو تفسیر آیات ۷/۱۶۸ و ۳/۵۵)۔ ان آیات سے دونوں فرقوں کا وجود قیامت تک انھیں مفسرین کے اقوال سے ثابت ہوجاتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ پر یہودیوں کے ایمان لانے کی تردید ہوجاتی ہے۔

یہ الزامی جواب ہے مگر اگر روایات کے انبار کو الگ کر کے قرآن حکیم کی آیات پر غور کیا جائے تو حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ اس آیت پر غور کرنے سے پہلے آیئے قرآن حکیم کی چند دوسری آیات پر غور کریں۔

(۱) وانفقوا من ما رزقنٰکم من قبل ان یاتی احدکم الموت فیقول رب لولا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق واکن من الصالحین (۶۳/۱۰)

ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس سے پہلے پہلے خرچ کرو کہ تم میں سے کسی کی موت کی گھڑی آجائے اور پھر وہ کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھکو اور تھوڑے دنوں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات کر لیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہوجاتا۔

یہاں خط کشیدہ الفاظ کو دوسرے لفظوں میں بیان کرنا چاہو تو من قبل موتکم سے ادا کر سکتے ہو۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ

زور کلام اس بات پر ہے کہ عجلت کرو کیونکہ موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔ دین کے معاملے میں عجلت ایمان کی نشانی ہے۔ و سارعوا الی مغفرۃ من ربکم (۳/۱۳۲)

(۲) یاایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ حق تقتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون۔ (۳/۱۰۲)

مسلمانو۔ اللہ سے ڈرو، ایسا ڈرو جو واقعی ڈرنا ہے اور دیکھو دنیا سے نہ جانا مگر اس حالت میں کہ اسلام پر ثابت قدم رہو)

دوسری جگہ ہے: یبنی ان اللہ اصطفی لکم الدین فلا تموتن الا وانتم مسلمون (۲/۱۳۲)۔ حضرت ابراہیمؑ و یعقوب اپنے بیٹوں کو وصیت فرماتے ہیں کہ (ترجمہ: اے بیٹو! اللہ نے اس دین اسلام کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا)۔ ان دونوں آیات میں فلا تموتن الا وانتم مسلمون کا وہی مفہوم ہے جو قبل موتہ یا من قبل موتکم کا۔ یعنی تاکید ہے کہ دین اسلام اور تقویٰ پر جلدی کرو اور علی الدوام مضبوطی سے قائم رہو، اس طرح کہ اسی پر خاتمہ ہو۔ زندگی کی کوئی آن بھی اس سے غفلت میں نہ گذرے۔ کیونکہ کس کو معلوم ہے کہ موت کب سامنے آکھڑی ہو۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ مرنے کا انتظار کرو اور مرنے لگو تو اسلام لے آؤ۔ یا تقویٰ اختیار کرو۔ سورۂ یٰسین کا سن لینا یا پادری صاحب کا بستر مرگ پر آکر مسیحؑ کے مصلوب ہونے کا اقرار کرا لینا کافی نہیں۔ اب ان آیات کی روشنی میں سورۃ النساء کی زیر بحث آیت کا مطلب پالینا کچھ مشکل نہیں۔ یہ واضح ہوگیا کہ قبل موت کے معنی کام میں عجلت اور دوام ہے اور یہ محاورہ زور کلام کے لئے استعمال ہوا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ مسیح کے مصلوب ہوکر مرنے کا عقیدہ اہل کتاب کے مذاہب کا ایک ضروری اور لازمی جزو بن گیا ہے اور اس کے رسوخ اور اس کے اختیار کرنے میں عجلت کا یہ حال ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ اس عقیدہ پر ایمان رکھے بغیر نہیں گذرتا (لیومنن بہ کی ضمیر سے واقعہ صلیب مراد ہے)۔

کفر بھی ایک ملت ہے۔ عقیدہ کا معاملہ دل سے ہے۔ جس طرح ایک مسلم راسخ العقیدہ ہوتا ہے اسی طرح کافر کو بھی اپنا عقیدہ محبوب ہوتا ہے۔ کل حزب بما لدیھم فرحون (۳۰/۳۲) یعنی یفرحون بما عندھم من امر الدین من البدعۃ والشرک والکفر۔ ہمارا دن رات کا مشاہدہ ہے کہ بدعتی، مشرک اور کافر اپنے عقیدہ پر جان چھڑکتے ہیں۔ کفر تو سراسر تقلید آبا، جمود اور غفلت کی سرشاری ہے اس میں پختگی کچھ مشکل نہیں۔ بچہ کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی بالیدگی کفر کے رسوم اور کفر کے ماحول میں ہوتی ہے اور تمام عمر کفر کی تاریکی میں گذر جاتی ہے۔ اہل کتاب کا بھی یہی حال ہے اور اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔ مسیحؑ کے دوبارہ نازل ہونے کے ذکر سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔

طلوع اسلام | یہ آیت قرآن کی ان آیات میں سے ہے جن میں گہرے غور و تدبر کی ضرورت ہے۔ محترم سوتی صاحب کی یہ فکر ارباب نظر کے لئے قابل غور ہے۔

۳۔ ستنول چشم بددور۔۔ | محترم عرشی صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"علامہ سید سلیمان صاحب سے بھی ملنے آنا! وہ معمولی ہستی نہیں ہیں۔" (محمد۔۔۔ ندوی لاہور ۲۰/۶/۵۳)

یہ اس مکتوب گرامی کے چند الفاظ ہیں جو مجھے کراچی کے دوران قیام میں ایک محترم ندوی فاضل نے بھیجا ہیں نے انھیں جواباً لکھا کہ ضرور مل کر آؤنگا۔ انشاء اللہ۔ اس غرض کے حصول کیلئے میں نے اپنے عزیز میزبان سے کہا کہ میں حضرت علامہ ندوی صاحب کی زیارت کرنا چاہتا ہوں، ازراہ کرم میری رہنمائی فرمایئے۔ انھوں نے نرم لفظوں میں اس ارادے سے باز رکھنا چاہا، لیکن میں مُصر رہا، آخر انھوں نے کہا:

کسی دن آپ کی یہ تمنا پوری کردی جائے گی۔

میں مطمئن ہوگیا۔ دو چار دن بعد ایک مولوی صورت بزرگ تشریف لائے، عزیز موصوف نے ان سے میرا تعارف کرایا کہ "یہ صاحب لاہور سے آئے ہوئے ہیں حضرت علامہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ انھیں کسی دن ساتھ لے جایئے" —— اس کے بعد میری طرف مخاطب ہوئے اور ان کے متعلق کہا کہ "یہ بزرگ حضرت علامہ کے ہاں آمدورفت رکھتے ہیں آپ ان کے ساتھ جا سکتے ہیں"۔

مجھے اس دن نزلے کی شکایت تھی۔ اس لئے میں نے انھیں آئندہ ملاقات کی تکلیف دی۔ کچھ دنوں کے بعد ۵ اگست ۱۹۵۳ء کو سہ پہر کے وقت وہ صاحب پھر تشریف لائے عزیز مذکور نے مجھے کہا کہ "آپ کے ساتھ حضرت علامہ کی ملاقات کے لئے وقت مقرر کر لیجئے"۔ —— میں نے کہا "ابھی تیار ہوں" —— بزرگ مذکور نے میرے اشتیاق کو سراہا لیکن عزیز گرامی نے ایک دفعہ پھر میرے ارادے کو کمزور کرنا چاہا اور کہا کہ

آپ ایک ہی دفعہ جائیں گے، دوبارہ جانے کی ہمت نہیں کرسکیں گے۔

میں نے ان کی بات ان سُنی کردی اور فوراً وضو کرکے نماز عصر ادا کی اور چل پڑا۔ فریر روڈ سے جہانگیر روڈ جانے والی بس پر سوار ہوگئے راہ میں محترم رفیق سے حضرت علامہ کے حالات، عادات، صحت وغیرہ دریافت کرتا رہا اور دل میں بڑے بڑے منصوبے باندھتا رہا کہ صرف ایک دفعہ ان صاحب کو تکلیف دینا ضروری ہے حضرت کے محل و مقام سے واقف ہو جاؤں گا تو خود ہی چلا جایا کروں گا۔ اور جب تک کراچی میں ہوں اس علم و فضل کے بحر ذخارسے استفادہ کرتا رہوں گا، ایسی عظیم تاریخی شخصیت سے استفادے کی توفیق پانا میری انتہائی خوش قسمتی ہوگی۔

پیدا کہاں ہیں ایسے فضیلت پناہ لوگ (میر بہ تغییر)

بس چل رہی تھی، منزل شوق و عقیدت نزدیک آرہی تھی۔ بارگاہ علم و عرفان کے تصور سے دماغ جگمگا رہا تھا، قرآنی مشکلات کا حل تاریخی گتھیوں کا سلجھاؤ، سلوک و معرفت کے اسرار کا انکشاف وغیرہ وغیرہ کئی امیدیں اور کئی تخیلات لئے ہوئے میں شہر کی گھما گھمی آبادی سے دور پاکیزہ فضا میں اس کوٹھی کے دروازے پر جا پہنچا جہاں "علامہ سید سلیمان ندوی" جلی حروف میں لکھا تھا۔ رفیق محترم آگے آگے اور میں ان کے پیچھے حضرت کی نشست گاہ میں داخل ہوئے اور سلام کہہ کر سامنے کی دو خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے مولویانہ شکل و صورت کے تین اصحاب ہم سے پہلے وہاں موجود تھے۔ علامہ مدظلہ صوفے پر جلوہ فرما تھے۔ نورانی چہرہ، سفید داڑھی، غالباً ململ کا کرتہ زیب تن کئے، تہمد باندھے ہوئے، ہاتھوں میں ایک ضخیم مجلد لئے مطالعہ فرما رہے تھے۔ نگاہ اوپر کئے بغیر میرے رفیق کی خیریت پوچھی اور پھر مصروف کتاب ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کتاب کو سرسری نظر سے دیکھ رہے ہیں کسی صفحے کو منٹ آدھ منٹ دیکھتے

پھر ورق گردانی شروع کردیتے۔ میں منتظر رہا کہ میرے متعلق میرے رفیق سے یا مجھ سے کچھ پوچھیں گے۔ یا رفیق صاحب خود ہی میرے شوق وعقیدت کا تعارف کرائیں گے۔ منٹ پر منٹ گذرتے گئے لیکن حضرت کے التفات کو میرے لئے فرصت نہ ملی۔ سامنے دیوار پر گھنٹہ لگا ہوا تھا اور میں بار بار دیکھ رہا تھا۔ میرے انتظار کے منٹوں میں اضلفے پر اضافہ ہو رہا تھا، اتنے میں ایک اور صاحب آگئے۔ وہ بھی سلام کرکے ہمارے پاس ہی بیٹھ گئے۔ چونکہ میں ان کے بالکل پاس ہی بیٹھا تھا، ان کو دیکھتے ہوئے شاید بلا ارادہ مجھ پر بھی ایک لمحہ کیلئے آپ کی نظر پڑ گئی اور پھر فوراً ہی پلٹ گئی۔ میں سمجھا کہ شاید اب تک مجھے نہ دیکھا ہو، اب دیکھا ہے تو ضرور ملتفت ہوں گے۔ کتاب کے بے عینک مطالعے سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کی نظر پر بڑھاپے کا کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ اور میں دو ڈھائی گز سے زیادہ فاصلے پر بھی نہیں تھا کہ نہ دیکھ سکنے کا شبہ ہو سکے۔

اب شام قریب ہو رہی تھی، میں نے مایوس ہو کر اپنے محترم رفیق سے کہا "آپ شاید ابھی بیٹھیں گے، میں روانہ ہوتا ہوں" ــــ انھوں نے کہا "ہاں میں بیٹھوں گا، آپ جا رہے ہیں؟" ــــ میں نے اثبات میں جواب دیا اور کرسی سے اٹھا۔ حضرت علامہ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "آپ جا رہے ہیں؟" میں نے عرض کیا "ہاں حضرت آپ سے استفادے کی غرض سے حاضر ہوا تھا اور آپ کو فرصت نہیں ہے" ــــ آپ نے فرمایا "ہاں یہ کتاب آج ہی بھارت سے آئی ہے" ــــ میں نے کہا "دارالمصنفین سے؟" ــــ آپ نے کہا "ہاں معارف ہے" [غالباً معارف کے سابقہ پرچوں کی جلد ہوگی] اتنے میں میں نا امید ہو کر کرسی پر بیٹھ چکا تھا ــــ آپ کی زبان مبارک سے نکلا "آپ جا سکتے ہیں" ــــ میں اس فقرہ کا ترجمہ یہی سمجھا کہ "فوراً نکل جاؤ یہاں سے ورنہ . . . . ؟" ــــ میں فوراً اٹھا اور "شکریہ وسلام" کہہ کر دل میں غالب کے مصرعے کا ورد کرتے ہوئے سڑک پر آ رہا

. . . . . . ترے کوچے سے ہم نکلے

خدا بھلا کرے غالب کا، اُسے کیا خبر تھی کہ اس کا یہ مصرع مجھے ایسے نازک وقت میں کام دیگا اور میری ڈھارس بندھائیگا ــــ میرا سفر لمبا تھا، میں نے ارادہ کیا کہ صدر تک پیدل چلوں گا۔ سیر بھی ہو جائے گی سفر بھی قطع ہوگا۔ اور پھر ٹرام یا بس کے ذریعے اپنی منزل پر پہنچ جاؤں گا۔

اس نہاروی میں میں مسلسل سوچتا رہا اور چلتا رہا یا اللہ! یہ بزرگ موجودہ عالم اسلامی کے غالباً بزرگ ترین مصنف ہیں۔ ضخیم ترین سیرت النبی کے مولف ہیں۔ کیا نبی کی سیرت کا کوئی ذرہ بھر اثر ان پر ہے؟ کیا نبی (صلعم) کی پوری زندگی میں کوئی واقعہ ایسا گذرا ہے جب کوئی غریب ان کی خدمت میں مشتاقانہ ومعتقدانہ حاضر ہوا ہو اور انھوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا ہو؟ کیا یہ بزرگ اسی دین کے نمایندے ہیں جس کی بنیاد ہی "خلق عظیم" پر رکھی گئی تھی؟ کیا یہ اسی عظیم شخصیت کے اسوۂ حسنہ کے مستند مبلغ ہیں جس نے کہا تھا

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

میری بعثت کی غرض وغایت ہی یہ ہے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کردوں۔

میں نے لاہور میں اپنے فاضل ندوی دوست سے کئی دفعہ سنا تھا کہ جب سے علامہ موصوف حضرت تھانوی کے حلقہ مریدین میں شامل ہوئے ہیں آپ کی کایا پلٹ ہوگئی ہے۔ آپ علماء ظاہر کی صف سے آگے بڑھ کر اصحاب باطن کے بھی قافلہ سالار ہو چکے ہیں۔

یا اللہ! کیا اصحاب باطن ایسے ہی ہوا کرتے ہیں؟ مجھے حضرت علامہ کے ظاہری و باطنی فضائل و کمالات میں شک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے صرف بیس پچیس منٹ تک آپ کو پاس بیٹھ کر دیکھا۔ اس مختصر تجربے سے مجھے آپ ایسی بزرگ ہستی پر کوئی مفصل تبصرہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اور آپ کی شخصی و ذاتی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر آپ کے متعلق کچھ لکھنا میرے اپنے دین و ایمان کے خلاف ہے۔ میں یہ سطریں لکھنے پر اس لئے مجبور ہوا کہ آپ کی انفرادیت ایک عظیم ملت کی اجتماعیت میں گم ہو چکی ہے۔ دنیا آپ کو اس لئے نہیں جانتی کہ آپ فلاں شخص کے بیٹے اور فلاں شخص کے پوتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ آپ اپنے علم و عمل سے اس امت کے ترجمان ہیں جو چالیس کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ نہ صرف ترجمان بلکہ رہنما بھی۔ ایک محقق اسلام آپ کی ذات میں اسلامی خوبیوں کو دیکھنے کی بجا طور پر امید رکھ سکتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ملنے والوں سے (خاکم بدہن) ایسا ہی برتاؤ کرتے جیسا آج حضرت علامہ سے مترشح ہوا تو ایک بھی شخص مسلمان نہ ہوتا! اور اگر میں نے براہ راست قرآن اور سیرت مبارکہ کا مطالعہ نہ کیا ہوتا اور صرف آپ کو دیکھ کر اسلام کو سمجھنے کی توقع رکھتا تو یقین کیجئے کہ میں آپ کی کوٹھی سے باہر نکلنے سے پہلے اسلام سے برگشتہ بلکہ متنفر ہو چکا ہوتا۔ (نعوذ باللہ منہا)

میں نے اس جگر خراش واقعہ کا اظہار اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ میری طرح جن اور حضرات کے ساتھ مولوی صاحبان کی طرف سے اسی قسم کا برتاؤ ہوا ہو اور وہ ان کے اس سلوک کی بنا پر خود اسلام کے متعلق دل میں غلط خیالات قائم کر بیٹھے ہوں وہ اس حقیقت سے مطلع ہو جائیں کہ ان حضرات کے کردار و سیرت کو اسلام سے کچھ تعلق نہیں۔ اگر وہ اسلام کے متعلق صحیح نقوش حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہ براہ راست قرآن کا مطالعہ کریں جس میں خدا کے احکام بھی ہیں اور اس کے پیش کرنے والے (علیہ التحیۃ والسلام) کی وہ سیرت مقدسہ بھی جسے خود خدا نے "خلق عظیم" کہہ کر پکارا ہے۔ اگر یہ حضرات مولویوں کے کردار و گفتار سے اسلام کا اندازہ لگائیں گے تو سخت غلطی کریں گے۔ پہلے زمانے میں تو یہ مشہور تھا کہ

گفتِ عالم بگوش جان نشنو ورنباشد بگفت او کردار

عالم کی بات کو سنو اس کے فعل کو نہ دیکھو۔ آج یہ بات ہو رہی ہے کہ عالم کا قول اور فعل دونوں ہی اسلام سے دور ہو چکے ہیں خدارا خود عالم بنو اور اپنی آنکھوں سے قرآن کو دیکھو۔ قرآن کے اندر آپ کو نہ صرف محمد رسول اللہ صلعم کی سیرت نظر آئے گی بلکہ بہت سے انبیاء و مرسل اور صلحا و ابرار کی سیرتیں غیر مشتبہ صحت کے ساتھ ملیں گی۔ قرآن اپنی بہت سی خصوصیات کے لحاظ سے بہت ہی اونچی کتاب ہے۔ اتنی اونچی کہ کوئی اونچے سے اونچا دماغ اس کی اونچائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہاں ہر زمانے کے لوگ بقدر ظرف اس ناپیدا کنار سمندر سے اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔

اخیر میں میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی سے اپنی دردمندانہ صاف گوئی کے لئے معافی چاہتا ہوں اور صدق دل سے عرض گذار ہوں کہ اگر وہ اپنی لکھی ہوئی سیرت النبیؐ کے مطابق اپنے اندر کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا کریں تو نہ صرف ان کا اپنا بھلا ہوگا بلکہ امت کو بھی اس سے بہت زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ عوام کی نظروں میں آپ کشتی کے ملاح ہیں، بلکہ جہاز کے کپتان ہیں۔ للہ اپنی ذمہ داری کو سمجھئے اور قریب پہنچی ہوئی موت کا خیال کر کے سوارانِ جہاز پر رحم کیجئے۔

یہ تو میں کہنا بھول ہی گیا کہ جب میں واپس اپنے ٹھکانے پہنچا تو عزیز میزبان نے ملاقات کی کیفیت پوچھی۔ میں نے مزاحاً کہا ــــ "میں آپ کو ولی مانتا ہوں، آپ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ ایک ہی دفعہ جائیں گے، دوبارہ جانے کی ہمت نہیں کر سکیں گے۔" بس آپ کی پیش گوئی پوری ہوئی۔ آئندہ میری توبہ" ــــ عزیز موصوف نے کہا "ہم بھی بڑے شوق سے گئے تھے اور ایسی ہی بیزاری لیکر واپس آئے تھے۔"

اس سے مجھے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ یہ معاملہ تنہا میرے ساتھ ہی نہیں ہوا کہ "موڈ" کے عدم توازن کا گمان ہو سکے بلکہ عادت راسخہ یہی ہے۔ افسوس!

عرشی

طلوع اسلام محترم عرشی صاحب نالاں ہیں کہ حضرت مولانا نے ان سے بات نہ کی اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انھوں نے توجہ نہ فرمائی۔ ورنہ اگر وہ بات کرتے اور انھیں معلوم ہو جاتا (جو ضروری تھا) کہ آپ وہی عرشی ہیں جو قرآن کو دین کی مکمل کتاب مانتے ہیں، تو جس بزم سے آپ "بہت بے آبرو ہو کر" ہی سہی، از خود نکل آئے تھے، وہاں سے یوں نکالے جاتے کہ۔ پابدستِ دگرے دست بدست دگرے۔ کا عملی منظر سامنے آجاتا۔

نوادرات

مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری

بڑا سائز ضخامت چار سو صفحات قیمت چار روپے محصول ڈاک نو آنے

ادارۂ طلوع اسلام۔ کوی روڈ۔ (نزد میراڈائز سینما) کراچی

حلقۂ معاونین طلوعِ اسلام

طلوع اسلام کی اشاعت بابت جولائی و اگست ۱۹۵۳ء میں ان چھیاسٹھ حضرات کے نام شائع ہو چکے ہیں جنہوں نے ہماری دعوت پر لبیک کہا اور معاونین کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد جو دیگر احباب حلقہ معاونین میں (۲۱ اگست تک) شامل ہوئے ہیں ان کے اسمائے گرامی شکریہ کے ساتھ درج ذیل کیے جاتے ہیں۔ معاونین کی کل تعداد اس وقت تک ایک سو چار ۱۰۴ ہوئی ہے۔ جو حضرات ابھی تک اس حلقہ میں شامل نہیں ہوئے وہ خود غور فرمائیں کہ قرآنی فکر اور نظام کی اشاعت کی اتنی بڑی اسکیم اس قلیل سی رقم کے ساتھ کس حد تک آگے بڑھ سکے گی۔ اسکیم یہ ہے کہ آپ ایک سو روپیہ کی رقم (یکمشت یا چار مساوی اقساط میں) ارسال فرما دیں۔ آپ کو رسالہ طلوع اسلام اور ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والی تمام کتابیں اس وقت تک بلا قیمت پیش کی جاتی رہیں گی جب تک آپ کی سو روپے کی رقم پوری نہ ہو جائے۔ اگر خدانخواستہ یہ سلسلہ بند کر دینا پڑا تو آپ کی بقایا رقم واپس کر دی جائے گی۔ ہمیں کم از کم اس قسم کے ایک ہزار معاونین کی ضرورت ہے۔ توقف نہ کیجئے۔ آپ کو کسی قسم کا بھی خسارہ نہیں رہے گا۔ اور آپ کی مدد سے قرآنی فکر و نظام کی اشاعت کا انتظام ہو جائے گا۔

فہرست معاونین خصوصی ادارۂ طلوع اسلام

کراچی (۶۷) اخلاص حسین صاحب۔ ابی سینیا لائن۔ کراچی
(۶۸) ابو الاثر جناب حفیظ جالندھری ،،
(۶۹) محمد یٰسین صاحب۔ گولیمار کوارٹرز ،،
(۷۰) فضل محمد سبحانی صاحب ،،
(۷۱) شوکت علی گردر صاحب۔ قیصر ناز۔ گارڈن ایسٹ ،،
(۷۲) عبد الحفیظ صاحب خواجہ۔ لارنس روڈ۔ ،،
(۷۳) ڈاکٹر عزیز الحسن صاحب ،،
لاہور (۷۴) شیخ سراج الحق صاحب لاہور
(۷۵) مرزا محمد خلیل صاحب ،،
(۷۶) جناب صلاح الدین صاحب۔ کرشن نگر ،،
(۷۷) ڈاکٹر ایم ایف بٹ صاحب۔ علامہ اقبال روڈ ،،

لاہور (۷۸) جسٹس محمد شریف صاحب۔ لارنس روڈ لاہور
(۷۹) میاں محمد امین الدین صاحب ہسپتال روڈ ،،
راولپنڈی (۸۰) طاہر ابرار انصاری صاحب ورکشاپی محلہ۔ راولپنڈی
(۸۱) مرزا احسان الحق صاحب ،،
(۸۲) ایس اے لطیف اینڈ سنز۔ ایڈورڈز روڈ ،،
گجرات (۸۳) محمد نذیر صاحب تاجر۔ دھرکیاں کلاں ضلع گجرات
(۸۴) حکیم غلام احمد صاحب۔ مرالہ تحصیل پھالیہ ،،
رسالپور (۸۵) کارپورل محمد لطیف صاحب آر۔ پی۔ اے ایف کالج رسالپور
(۸۶) فلائٹ سارجنٹ بشیر حسین صاحب ،، ،،
(۸۷) سارجنٹ سید باقر علیم صاحب ،، ،،
مردان (۸۸) حکیم عبد المالک خان صاحب تخت بھائی ضلع مردان

مردان (۸۹) میاں کرم شاہ صاحب ٹھیکیدار مردان
(۹۰) شیر محمد خاں صاحب " "
شیخوپورہ (۹۱) نذیر احمد صاحب ڈسٹرکٹ بورڈ آفیسر شیخوپورہ
(۹۲) چوہدری لال خانصاحب موضع آہدیاں تحصیل شاہدرہ
کیمل پور (۹۳) چودھری امیر الدین صاحب چوک ٹھاکراں۔ کیمبلپور
مظفرگڈھ (۹۴) محمد الیاس خانصاحب بدھ ضلع مظفرگڈھ
گوجرانوالہ (۹۵) چوہدری غلام علی صاحب اسلام آباد۔ گوجرانوالہ
پشاور شہر (۹۶) مرزا علی احمد صاحب اسکندرپورہ پشاور شہر
نوشہرہ (۹۷) کپتان ایس بی علی صاحب نوشہرہ
بنوں (۹۸) ایک صاحب جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔
کوئٹہ (۹۹) " " " "
جڑانوالہ (۱۰۰) مس افتخار النساء صاحبہ معرفت ایس علی حسن صاحب جڑانوالہ
قصور (۱۰۱) برکت علی صاحب ہیڈ ٹرینر کلرک قصور
ٹھٹھہ (۱۰۲) جناب محمد صبیح صاحب بی اے بی ایل ایڈووکیٹ ٹھٹھہ
ڈھاکہ (۱۰۳) نبی حسن صاحب مالک نبی ہوزری
فرید آباد ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)
سعید پور (۱۰۴) محترمہ ثریا عندلیب مسز حبیب اللہ خانصاحب
ای بی ریلوے ورکشاپ۔ سعید پور (مشرقی پاکستان)

معراج انسانیت

معارف القرآن۔ جلد چہارم

ترجمان حقیقت جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قرآن علیہ التحیہ والسلام خود قرآن کے آئینہ میں۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرور کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمے وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گرد پوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔ قیمت بیس روپے۔ محصول ڈاک و پیکنگ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے۔

ادارہ طلوع اسلام۔ کوی روڈ۔ (نزد پیراڈائز سینما) کراچی

ادارۂ طلوع اسلام کی مطبوعات ایک نظر میں

معراج انسانیت ترجمان حقیقت جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں۔ جو اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ ابتدا میں قریب پونے دو سو صفحات پر دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرور کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑا سائز۔ قریب نو سو صفحات۔ کاغذ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط و حسین، گرد پوش مرصع و دیدہ زیب ٹائیٹل اور صبیح بہارکے عنوانات منقش و رنگین قیمت بیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

نوادرات علامہ حافظ محمد اسلم صاحب کے نادر مضامین کا قابل قدر مجموعہ۔ ضخامت چار سو صفحات قیمت صرف چار روپے (علاوہ محصولڈاک)

اسلامی نظام دور حاضر کی ایک بلند پایہ کتاب جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام و آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کے وہ مقالات شامل ہیں جنہوں نے قوم کے سنجیدہ طبقہ کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھولدی ہیں۔ ضخامت ۱۸۴ صفحات مجلد مع گرد پوش قیمت دو روپے (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی دستور پاکستان آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں ادارہ طلوع اسلام کی پیشکش۔ قرآن کی روشنی میں مسودات قرارداد مقاصد و بنیادی اصول و حقوق جو حکومت کے اعلان کے جواب میں بھیجے گئے۔ ساتھ ہی حکومت کی جانب سے پاس کردہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید۔ مولوی صاحبان کے بائیس نکات کا تجزیہ اسلامی جماعت کی دستوری سفارشات پر تبصرہ۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات مجلد مع گرد پوش قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ (علاوہ محصولڈاک)

اسباب زوال امت (پرویز) دور حاضر کی انقلاب آفریں کتاب۔ مختصر مگر ہماری ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ جس نے قوم کے سنجیدہ تعلیمیافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا؟ ضخامت ۱۵۰ صفحات مجلد مع طلائی گرد پوش قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

تین اہم عنوانات ملا کے مذہب کے عجیب و غریب حقائق۔ مثلاً (۱) تبدیل مذہب کرنیوالوں کو قتل کر دیا جائیگا۔ (۲) غلام اور لونڈیاں بے حد و نہایت بلا نکاح حرم سراؤں کی زینت بنائی جا سکیں گی۔ (۳) یتیم پوتوں کو وراثت سے محروم رکھا جائیگا — قرآن کی روشنی میں ملا کے خود ساختہ مذہب کا ابطال اور ان تینوں مسائل کا حل اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے۔ ضخامت ۲۱۲ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

سلیم کے نام خطوط محترم پرویز صاحب کے قلم سے۔ ہمارے نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جسقدر شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ شاداب اور سائنٹفک انداز میں تسکین بخش جواب۔ عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کی گئی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکہ آرا مسائل حل کر کے رکھدیئے گئے ہیں جنہیں ضخیم ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ضخامت بڑے سائز کے ۲۵۴ صفحات۔ مجلد مع حسین گرد پوش۔ قیمت چھ روپے (علاوہ محصولڈاک)

ہماری بصیرت کے مطابق قرآنی فیصلے دور حاضر کی ایک اہم کوشش جس میں روزمرہ زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات کے متعلق قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان مسائل و معاملات میں قرآن کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کتاب آپ کو دوسرے سہاروں سے بے نیاز کر دے گی۔ ضخامت ۴۰۸ صفحات۔ قیمت مجلد مع گرد پوش چار روپے (علاوہ محصولڈاک)

جشن نامے بلند حقائق کا مجموعہ اور عبرت و موعظت کا مرقع۔ ایسے ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر بیک وقت آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ طنز و تنقید کے ایسے گہرے نشتر اور اثر و درد کے ایسے خونچکاں منظر شاید ہی کہیں مل سکیں۔ یہ کتاب ہمارے چھ سالہ دور آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ ہے۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت مجلد مع گرد پوش دو روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

ادارۂ طلوع اسلام۔ کوی روڈ (نزد ہیرڈ ائز سینما) کراچی

روزمرہ زندگی کے اہم مسائل و معاملات کے متعلق

ھماری بصیرت کے مطابق

قرانی فیصلے

دور حاضرہ کی عظیم الشان کوشش جس میں روزمرہ زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات کے متعلق قران کی روشنی میں بحث کی گئی ھے اور بتایا گیا ھے کہ ان مسائل و معالات میں قران کا فیصلہ کیا ھے۔ یہ کتاب آپ کو دوسرے تمام سہاروں سے بے نیاز کردیگی۔ اسے فقہ کی کتاب نہ کھئے۔ اس سے قران کی بصیرت افروز راہ نمائی حاصل ھوگی۔

ضخامت چار سو آٹھ (۴۰۸) صفحات۔ قیمت مجلد چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام
کوی روڈ (صدر) ۔ کراچی

REGD. NO. S. 1089

طلوع اسلام کی نئی پیشکش

جشن نامے

یہ ایک عجیب و غریب کتاب ہے جس کی مثال ہمارے لٹریچر میں کہیں نہیں ملیگی۔ آزادی ہے کیا مفہوم ہے جشن کسے کہتے ہیں جشن آزادی کیا ہوتا ہے طلوع اسلام نے ہر سال جشن آزادی کی تقریب پر کیا کیا مشورے دئے اور جشن منانے والوں کی نگاہوں کا رخ کس طرف پھیرا، یہ سب کچھ آپ کو اس نئی کتاب میں ملیگا۔ جس کا نام ہے۔

جشن نامے

یہ کتاب بلند حقائق کا مجموعہ اور عبرت و موعظت کا مرقع ہے۔ شروع میں قریب پچاس عنوانات ایسے ہیں جنہیں پڑھکر بیک وقت آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آجائیں طنز و تنقید کے ایسے گہرے نشتر اور اثر و درد کے ایسے خونچکاں منظر شاید ہی کہیں مل سکیں۔ کتاب کیا ہے ہمارے چھ سالہ دور آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ ہے۔

ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت مجلد مع گردپوش دو روپے آٹھ آنے۔

بہت جلد منگا لیجئے کیونکہ کتاب محدود تعداد میں چھپی ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
کوی روڈ (صدر) کراچی

Only Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Rd., Karachi and Text at Adabi Press, Robson Road, Karachi. Published by Said Ahmed from Tulu.e-Islam Office Kawi Road, Karachi.